ماں جی

(اردو زبان کے ماؤں سے متعلق کچھ خوبصورت افسانے)

مرتبہ

ڈاکٹر خلیل طوقار

DEMAVEND

DEMAVEND

Demavend Yayınları:
Elektronik yayınlar serisi: 22
İstanbul, Mart 2022
Yayın yönetmeni: Neval Güzelyüz
Editör: Prof. Dr. Ali Güzelyüz
Hazırlayan: Prof. Dr. Halil Toker
Kapak tasarımı ve iç düzen: Demavend
Dili: Urduca
Kitabın Orjinali: Anneciğim (Mân-cî)

© Bu eserin bütün hakları **Demavend Yayınları**'na aittir. 5846 Sayılı Fikir ve Sanat Eserleri Yasası'nın hükümlerine göre eserin tamamı ya da bir bölümünün, izinsiz olarak elektronik, mekanik, fotokopi veya herhangi bir kayıt sistemi ile yayınlanması, çoğaltılması ya da depolanması yasaktır.

Katkı / Credits:
Bu kitabın kapağı "Freepik.com" internet sitesinden alınan resimler ile tasarlanmıştır.
The cover has been designed using images from "Freepik.com"

T.C. Kültür ve Turizm Bakanlığı
Yayıncı Sertifika No: 51286
ISBN: 978-625-7087-26-1

Demavend Yayınları
Başak Mah. Mimar Sinan
Cad. No 2AD, D 47
Başakşehir-İSTANBUL
☎ : 0090 212 500 36 07
demavend@demavend.com.tr
http://www.demavend.com.tr

Kütüphane Bilgi Kartı
(Cataloging-in-Publication Data)
1. Urdu edebiyatı 2. Hikâye 3. Anne
4. Öykü

پیش لفظ

ہماری مائیں دنیا میں ہمارا سب سے قیمتی اور مقدس اثاثہ ہیں۔ ہماری مائیں ہیں جو ہمیں پیدا کرتی ہیں، خود جاگتے ہوئے ہمیں سلاتی ہیں، کھلا پلا کر ہمیں پروان چڑھاتی ہیں۔ ہماری مائیں ہیں جو ہماری خیر وعافیت اور سلامتی کے لئے مسلسل دعا مانگتی ہیں۔ عام طور پر اُن کے دورانِ زندگی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان کی قدر و قیمت اور ان کی منزلت کا ادراک صحیح معنوں میں نہیں کر پاتے البتہ جب وہ اس عالم فانی سے عالم بقا کی جانب رحلت کر جاتی ہیں اور بالخصوص وہ مسائل، مصائب اور مشکلات کی زد میں آتے ہیں اور انھیں اپنا غم والم کی داستان سنانے اور حوصلہ افزائی یا دل جوئی کرنے والا کوئی نہیں ملتا تب انھیں علم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی والدہ کی دعاہائے خیر ان کے لیے کس قدر اہم تھیں۔ تب انھیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی والدہ کی رحلت کے بعد جو بڑا خلا ان کی زندگی میں پیدا ہوا ہے وہ کس قدر خوفناک ہے۔ پھر وہ دل ہی دل میں اپنی ماؤں کو یاد کر کے "کاش والدہ زندہ ہوتیں" کہنا شروع کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زندہ ہوں یا انتقال فرما چکی ہوں ہماری ماؤں کی ہمارے حق میں دی ہوئی قربانیاں اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے انمول لمحے ہمارے تحت الشعور میں منقوش ہوتے ہیں اور ان کرشماتی لمحوں کی خوبصورت یادیں وقتاً فوقتاً ہماری آپس کی گفتگوؤں کی زینت بنتی ہیں۔ البتہ اگر فرد کوئی ادیب یا شاعر ہو تو وہ اپنی ان یادوں اور دل میں جنم لینے والے احساسات کو کبھی ایک نظم اور کبھی ایک افسانے کی صورت میں سفید کاغذ پر منتقل کر کے ان احساسات بھرے لمحوں میں ہمیں بھی شریک کرتا ہے۔

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دنیا جہان کے تمام ادبیات کی طرح اردو ادب میں بھی مامتا، مامتا کے احساسات، ماؤں کی محبت اور اپنے بچوں کے لیے ان کی قربانیوں

سے لبریز کہانیوں کے شاہکار نمونے قلمبند کئے گئے ہیں اور اردو ادب اس میدان میں دنیا کے کسی بھی ادب سے کمتر نہیں۔

لہٰذا راقم الحروف کو اردو ادب کے ان عالیٰ معیار افسانوں کا انتخاب کر کے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی خواہش کافی عرصے سے تھی اور یہ مجموعہ اب آپ سب کے سامنے ہے۔

ہماری اس مختصر کاوش میں اردو ادب میں موجود مامتا اور ماں سے متعلق کچھ خوبصورت افسانوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ منتخب افسانے اردو جاننے والے اور اردو سیکھنے والے قارئین کرام کے لیے دلچسپی اور پسندیدگی کا باعث بنیں گے۔

ڈاکٹر خلیل طوقار

مندرجات

﴿ماں جی﴾ قدرت اللہ شہاب ۶

﴿مامتا﴾ احمد ندیم قاسمی ۱۹

﴿امّی﴾ اشفاق احمد ۳۳

﴿دودھ کی قیمت﴾ منشی پریم چند ۳۵

﴿مامتا﴾ کرشن چندر ۶۳

﴿تین مائیں ایک بچہ﴾ خواجہ احمد عباس ۶۹

﴿ماں کا دل﴾ خواجہ احمد عباس ۹۰

﴿بدنصیب ماں﴾ پریم چند ۱۰۴

﴿اولاد﴾ سعادت حسن منٹو ۱۲۲

﴿موم بتی کے آنسو﴾ سعادت حسن منٹو ۱۳۰

﴿ماہی گیر﴾ سعادت حسن منٹو ۱۳۳

افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف ۱۴۲

قدرت اللہ شہاب

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔ جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو بار کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے اُن کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ اُن دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی کی مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ اُنھوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف اُن کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت اُن کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن اُن کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے تو وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔

ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی اُنہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے تھے۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی اور نہ کوئی زیور۔ اسبابِ دنیا میں اُن کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔ پہننے کے لئے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن، دوسرا اپنے

ہاتھوں سے دھو کر تکئے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا اُن کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لئے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیئے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی اُنھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکئے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں، اسی خموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اس موقع کے لئے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں، کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھالے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ اُن کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھالیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔

دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لئے اُنھوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لئے مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو اُنھوں نے

اپنی زبان سے کبھی میرے بیٹے یا میری بیٹی کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ اُن کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی اُن کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں اُن کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہ کہیں سرِ راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا لیکن کسی راہ گزار پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر اُنھوں نے چک نمبر ۳۹۲ جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دئے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمۂ مال کا عملہ پڑتال کے لئے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹ منٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں اُن کے برتن اور بستر قرق کر لئے گئے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی

کے کانوں سے اتروالیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی۔ جس سے ماں جی کے کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لئے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تا کہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں پر ایک جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لئے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریئے اور کلتھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھیں۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو الّن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر اُن کو ایک مربع زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں اُن کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے اُن کی آنکھوں میں پڑ گئے۔

جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد اُنھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ائیر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح اُن پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دئے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لئے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ اُن کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لئے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے لئے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے۔ یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھئے کون خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا! ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر اُن سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پت" ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہو گئی۔ ان دنوں سارے علاقے میں عبد اللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبد اللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر اُنھوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبد اللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سر سید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ اُنھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبد اللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبد اللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد اُنیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سر سید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں پر جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے عبد اللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا تاکہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور اُنھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ اُنھوں نے لاکھ سمجھایا، بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟ سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

جی ہاں عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے اُنھوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے، اتنے ہی سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ میں گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ اُن کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر اُن سے پانچ پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے، کئے لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی عبد اللہ صاحب نے پوچھا۔

اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈال دوں گی۔ ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبد اللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی اُنھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبد اللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبد اللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرہ بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول اُن پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور اُن کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ اُنھوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ اُنھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر ہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ اُن کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا مسٹر گورنر، جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں، براہِ مہربانی میری طرف سے آپ اُن کے ہاتھ چوم لیں۔

دعوت کے بعد عبد اللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک کونے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبد اللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟

میں ماں جی تنک کر بولیں۔ میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟

میں عبد اللہ صاحب نے ڈرامہ کیا۔ میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا، جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا۔

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا لیکن ایک بار ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات گورنری کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو اُنھوں نے عبد اللہ صاحب سے گلہ کیا۔

بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!

عبد اللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو در اصل تمہاری سوتن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبد اللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاب سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی سے اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبد اللہ صاحب کی خبر لیں۔

جب یہ مقدمہ مہاراجہ پرتاب سنگھ تک پہنچا تو اُنھوں نے عبد اللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبد اللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔ اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ مہارانی نے کہا۔ کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔

مہاراجہ اور مہارانی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔ اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیب کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی!

جب عبد اللہ صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبد اللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر اُن کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دئے تھے کیا اُن کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟

ماں جی نے نئی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ اُن کے سینے میں بیک وقت بہت خیال امڈ آئے۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبد اللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا لیکن عبد اللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی بچہ رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے سو رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ اُن کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا، ورنہ اُن کو تکلیف پہنچے گی لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الہڑ دلہن سمجھا اور جس نے گورنری کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی، لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

﴿قدرت اللہ شہاب، پاکستانی ادب، جلد ۶، روالپنڈی، سن اشاعت ۱۹۸۱ء، ص ۳۹۷۔۴۰۶﴾

احمد ندیم قاسمی

ممتا

پنجاب سے مجھے برطانیہ کے ایک افسر نے بھرتی کیا اور چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ بھیج دیا، جہاں چینی بستے تھے اور انگریز گورنر راج کرتا تھا۔ مدتوں سے ہانگ کانگ پولیس کے لئے پنجاب سے سپاہیوں کے گروہ کے گروہ تو برآمد کئے جاتے ہی تھے۔ لیکن اب ادھر یورپ میں ہٹلر نے جنگ چھیڑ دی تھی اور انگریز وہاں بہت عدیم الفرصت ہو رہا تھا، اس لیے ہانگ کانگ پولیس کے لئے پنجابی نوجوانوں کی مانگ دگنی ہو گئی تھی۔ میں کچھ ایسے گٹھے ہوئے جسم کا جوان نہیں ہوں۔ فوجی بھرتی میں کئی بار منہ کی کھائی ہے۔ مگر اب کے ڈاکٹر نے میری باہر نکلی ہوئی پسلیوں سے نظریں بچا کر میرے لمبے قد کی تعریف کی اور کہا کہ اتنے دراز قد نوجوان سپاہی کو دیکھتے ہی چینی باشیے دہل کر مرجائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ سے کم قد کے نوجوانوں کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے اور اس سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ ہانگ کانگ لے آیا۔

میں نے پرانے ہانگ کانگی سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں بڑے مزے ہیں۔ ہر اس ملک میں پولیس کے مزے ہیں جس پر کوئی دوسرا ملک راج کرتا ہے اور ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ پستہ قد گداگر چینی عورتوں کو سڑکوں اور بازاروں کی پٹریوں سے بھگا دو اور جب اُن کی گودوں میں سے اُن کے بچے پاؤں سے جوتوں کی طرح نکل جائیں تو اُن کو گندے چیتھڑے کی طرح چٹکی سے پکڑ کر اُن کی ماؤں کی طرف اچھال دو اور پولیس ہیڈکوارٹر میں آکر اس روپہلی خدمت کی سنہری سند حاصل کرلو۔

کولون اور اصل چین کی سرحد پر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو اور اس کا بوجھ ہلکا کرکے اسے پھر چین میں دھکا دے دو۔ لیکن جب ہمارا جہاز سنگاپور پہنچا تو ایک مدراسی نے ہوائی اڑا دی کہ ادھر مشرقی سمندروں میں بھی جنگ ہونے والی ہے۔ جہاز کے انگریز کپتان نے یہ افواہ سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غلط افواہ پھیلانے کے جرم میں مدراسی جہازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور سنگا پور ہی میں انگریز پولیس کے حوالے کر دیا۔۔۔ تاکہ افواہ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔

جب ہم ہانگ کانگ پہنچے تو فضا سرگوشیوں میں چھلکتی معلوم ہوئی۔ جنگ ہونے والی ہے، جنگ ہونے والی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں زبانیں پیدا ہوگئی تھیں اور لوگ یوں تیورا تیورا کر چلتے تھے جیسے قدم قدم پر اُن کے سینے کے اندر ہی گولی چل جاتی ہے۔ ہانگ کانگ اور کولون کی بل کھاتی سڑکوں کی پٹریوں پر بیٹھے ہوئے چینی پناہ گزین افق کی طرف یوں تکتے رہتے تھے جیسے طیاروں کے انتظار میں ہیں۔ اُن کے پھٹے ہوئے ہونٹوں اور اچٹتی ہوئی پپڑیوں میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا، "جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایک دم سے کیوں نہیں ہو چکتا۔"

بھوکے پیاسے چینی بچوں کے ہجوم روٹی کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ ایک انگریز حکمران نے انتظامیہ کے ایک اجلاس کے دوران میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اتنے بہت سے بچوں کا کفیل ہونا حکومت کا فرض نہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ زندہ ہیں اُن کے گلے میں کتوں کی طرح پٹے ہونے چاہئیں اور گلے میں پٹے کے بغیر جو لڑکا دکھائی دے اسے کولون کی سرحد پر لے جاکر اصلی چین میں دھکا دے دینا چاہیے۔ پولیس کے لئے پیدل سیر کرنے والے صاحب لوگوں کی آسائش کی خاطر پٹریاں صاف رکھنے کا کام سخت دشوار ہو رہا تھا۔ مورچے کھد رہے تھے۔ پناہ گاہیں تعمیر ہو

رہی تھیں۔ عمارتوں کے حسن کو ریت کی بوریوں نے چھپا لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ سارے کا سارا ہانگ کانگ زیر تعمیر ہے۔

کہتے ہیں ایک زمانے میں ہانگ کانگ کی روشنیاں جب سمندر میں ڈبکیاں لگاتی تھیں اور پھر جب پانی ان روشنیوں کو اوپر انہی روشنیوں کی طرف اچھال دیتا تھا تو پرانے بوسیدہ جسموں میں بھی انگڑائی کی اینٹھن رینگنے لگتی تھی۔ مگر اب ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر ساری دنیا کے اندھیرے کا منبع معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں دن کی تربیتی پریڈ سے تھک ہار کر بیرک میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ادھر ادھر کی مزے مزے کی باتیں سوچنے کی کوشش کرتا، مگر اندھیرے اور سناٹے کی دہشت میرے کانوں میں بمباروں کی بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور میں اپنی ماں کو یاد کر کے رو دیتا۔

دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور فق چہرے دیکھتا تو یوں محسوس کرتا تھا جیسے یہ سب کے سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں اورانہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی مگر دن کے ہنگاموں میں اس تصور سے باربار کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا البتہ رات کو یہ تصور میرے ذہن میں اور میری آنکھوں سے چمٹ کر رہ جاتا اور میں تکیے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح روتا رہتا۔

ماں نے مجھے ہانگ کانگ آنے سے روکا تھا اور کہا تھا، "ہانگ کانگ تو وہاں ہے جہاں سے آگے سنا ہے دھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ بیٹا تم دلی کلکتہ میں ہوتے تو میں تمہیں خوابوں میں ٹٹول لیتی، پر تم تو ہانگ کانگ جارہے ہو۔ تمہارے میرے درمیان سمندر اور پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لال لام اگر ادھر بھی ہونے لگی اور تمہارے دشمنوں پر بھی کوئی آنچ آگئی تو بتاؤ میں یہاں اس اجڑے پجڑے گاؤں میں کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھوں گی۔ نہ جاؤ میرے بیٹے، مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے۔ میں سوچتی

ہوں، وہاں تمہارے کپڑے کون دھوئے گا؟ تمہارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا؟ تمہاری آنکھ میں سے گری ہوئی پیک کون نکالے گا؟ تمہارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا؟ اور پھر پچھلے سال کی طرح تمہارے دشمنوں کو نمونیا ہو گیا، تو؟ پچھلے سے پچھلے سال کی طرح، میر ی زبان کو ئلہ ہو جائے، اگر تمہارے دشمنوں کے آدھے سر میں درد اٹھا تو تمہاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون ملے گا؟ نہیں بیٹا نہ جاؤ چلو میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤ۔ بھوکوں مریں گے پر اکٹھے تومریں گے۔ اور بیٹا تم ہانگ کانگ میں ہوئے اور ادھر میں مر گئی تو میری قبر میں تمہارے حصے کی مٹھی بھر مٹی کون ڈالے گا۔ جو مولوی جی کہتے ہیں ماں کی قبر اندھیرے میں جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہے، بتاؤ۔"

لیکن میں چلا آیا تھا اور جب آتے وقت میں نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی کوئی جھری ایسی نہ تھی جس میں آنسو ندی بن کر پھیل نہ گئے ہوں۔ آنسوؤں میں ڈوبا یہ چہرہ جیسے میری پتلیوں میں گھس گیا تھا۔ رات کو بیرک میں مجھے اس فق چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور پھر میں ماں کی جمی ہوئی نظروں سے ڈرنے لگتا اور حواس باختہ ہو کر اس سے سرگوشی کرتا تھا، "ماں تمہاری پلکیں جھپکتی ہی نہیں۔ تمہاری پتلیا ں تو ہلتی ہی نہیں، تم کسے دیکھ رہی ہو ماں!"اور یہ سوال میں اس لیے پوچھتا تھا کہ مجھے میری ماں چینی پناہ گزینوں کی طرح افق کی طرف تکتی نظر آتی تھی۔ جہاں سے کہتے ہیں ایک منٹ میں ایک ہزار بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو نمودار ہونا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ نظریں افق پر جمی رہ گئیں۔ بمبار کسی اور سمت سے آ نکلے۔ پیانو اور آرگن کی صداؤں میں لپٹا ہوا ہانگ کانگ بموں کے دھماکوں سے بلبلا اٹھا۔ طیارہ شکن توپیں چند مرتبہ بھونکیں اور پھر گردنیں نہوڑا کے تھکے اژدھوں کی طرح پلٹ گئیں۔ بجلی اور تار کے اکھڑے ہوئے

کھمبے بلندی پر سے پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرے اور سڑکوں پر بکھرے ہوئے، پناہ گزینوں کا بھیجہ چاٹتے ہوئے ساحل پر بکھر گئے۔ شہروں کی عمارتوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ دیواروں کے ملبے باغیچوں میں آن گرے تو باغیچے کی جھاڑیاں ہال کمرے میں بکھر گئیں۔ ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے ایک پنجابی سپاہی کے پیٹ میں بم کا ایک سپلنٹر پیوست ہو گیا۔ انتڑیاں باہر نکل آئیں، موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے تو اس کی انتڑیاں اس کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتار لی۔

ہم غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کو پناہ گاہوں میں دھکیل دیا گیا۔ جہاں انگریز بچے اور انگریز مائیں تک "ممی ممی" کراہ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی انگریز عورت پناہ گاہ کے دروازے کے پاس سے ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تلے کھڑے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی کو مسلے جارہی تھی اورجب وہ آخری چہرہ پڑھ چکی تو "میرا بیٹا" کہہ کر دھم سے گر پڑی اور ہم سب کے منہ لٹک گئے۔

جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ اس روز میں خوب خوب رویا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں، جیسے جنگ نے میری بانہوں سے میری ماں کو کھسوٹ لیا ہے، جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا تھا مگر اب اس کی لاش کو دفن کرکے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں۔ باوجود ہزار کوشش کے اب ماں کا فق چہرہ بھی میرے سامنے نہیں ابھرتا تھا۔ اس چہرے کے مانوس نقوش دھندلا گئے تھے، ہر طرف جیسے غبار اڑنے لگا تھا۔

چند روز تک اسی کیفیت میں قیدیوں کے باڑے میں بند پڑا رہا۔ میرا بند بند ٹوٹ چکا تھا اور جسم بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کبھی بھولے سے سرہلایا توکچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پتھر ایک کان سے لڑھک کر دوسرے کان سے ٹکرا گیا ہے۔ بعض اوقات پھیپھڑوں میں سانس جاتی تھی اور وہیں کی ہو رہتی تھی اور میں سینے پر گھونسا مار کر دوسری سانس لے پاتا تھا۔

مگر جلد ہی میں اس قید سے مانوس ہو گیا اور پھر جاپانیوں سے مانوس ہونے میں تو مجھے کوئی دیر نہ لگی۔ میری قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "اسے باندھ لو"ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی۔ حکم ملا کہ سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ حکم دینے والا جاپانی افسر الٹے قدموں پیچھے ہٹا تو ایک چھوٹے سے گڑھے نے اسے لڑکھڑا دیا، اس کی ٹوپی گر پڑی اور عینک کا ایک بازو کان سے ہٹ کر لٹکنے لگا۔ میرے قریب کھڑا ہوا سربلند مسکرا دیا۔ "مسکراتا ہے؟"ایک جاپانی افسر نے سوال کیا اور پھر ایک گولی سن سے آئی، سربلند کی پسلیوں کو توڑتی باہر نکل گئی۔ ایک لمحے کے لئے میں مرگیا۔ پھر جب جاپانیوں کو بے تحاشا ہنستے سنا توہوش آیا ہنسی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ گولی سربلند کے جسم سے نکل کر اس کے عقب میں کھڑے ہوئے وارث کے پیٹ میں گھس گئی تھی اور سر بلند پیچھے گرا تھا تو وارث منہ کے بل گرا تھا اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے جسم نوچ ڈالے تھے اور وارث کی موت جاپانیوں کے لئے لطیفہ بن گئی تھی۔

اس روز سے ہم سب نے ایکا ایکی جاپانیوں سے مانوس ہونے کی آخری منزل طے کرلی۔ حکم ملے تومسکراؤ حکم ملے تو نظریں اٹھاؤ۔ حکم ملے تو خشک گلے تر کرنے کے لئے منہ کا لعاب نگلو اور اگر حکم نہ ملے تو مٹی کے مادھو کی

طرح جس انداز اور جس رخ سے کھڑے ہو کھڑے رہو۔ اور پھر میں جینے کے معاملے میں بہت لالچی ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر جینا چاہتا تھا کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی، کبھی تو کوئی جہاز مجھے اپنے سینے پر بٹھا کر سنگاپور سے گزرتا ہوا ہگلی میں داخل ہو گا اور ریل گاڑی مجھے کلکتے سے پنجاب لے جائے گی، جہاں میں اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور قیامت تک یونہی بیٹھا رہوں گا۔ جینے کے اسی لالچ کے سبب میں نے جاپانیوں کے حضور میں کبھی کوئی گستاخی نہیں کی۔

کافی دنوں تک ہم ہانگ کانگ ہی میں اپنے نئے حاکموں کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ہم ایسے سدھ گئے تھے کہ ہم نے سرکس والے ہاتھیوں کو مات کر دیا تھا۔ ایک روز ہمیں ایک جاپانی افسر نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے قریب ہی ساحلی جزیروں میں سے ایک چھوٹے سے جزیرے پر سو ڈیڑھ سو چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہے اور اب وہ ہانگ کانگ تک چھاپا مارنے کی سوچ رہے ہیں۔ اُن کی گوشمالی کے لئے ہانگ کانگ سے جاپانی فوجیوں کا ایک دستہ بھی جانے والا تھا۔ جس میں وفادار اور تابعدار قسم کے قیدیوں کو بھی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس دستے میں میرا نام سرفہرست تھا۔ رات دو بجے ہم سب ایک دخانی کشتی پر سوار ہوئے۔ آج ہوا معمول سے زیادہ خنک ہو رہی تھی اور میری قمیض کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے بھر گئے تھے۔

ایک دوسرے میں گھستے سمٹتے ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیے تھے۔ اتنی اجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی پیالی کی طرح نمودار ہو گئی۔ اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی ان گنت پگڈنڈیاں، اُن کے قریب آکر غائب ہو رہی تھیں۔ جھونپڑوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ اُن کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ اُن کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک دائرہ اور پھر سب کے آخر میں ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ۔ سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا، بالکل کھلونا سا اور جب سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تھا تو میرے قدموں تلے چینی کی یہ پیالی تیرتی اور ڈولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیر تک انتظار کرنے کے باوجود ابھی تک ہمیں جھونپڑوں کے آس پاس کوئی بچہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی جھونپڑے سے دھواں تک نہیں اٹھتا تھا۔ کسی بوڑھے کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔ صرف ایک کتا گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ تنگ آکر دستے کے جاپانی لیڈر نے اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کر دیا اور پھر ہم سب دبک کر زمین سے چمٹ گئے۔ مگر یہ فائر بھی جھونپڑوں کے آس پاس زندگی کا کوئی ثبوت نہ ابھار سکا۔ بس اتنا ہوا کہ کھیلتا ہوا کتا کان کھڑے کر کے ایک لمحہ ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر جھونپڑوں میں بھاگ گیا۔ چڑیاں بہت سی ڈاروں کی صورت میں مشرق کی طرف کچھ یوں اڑ گئیں جیسے ابھرتے ہوئے سورج میں گھس کر دم لیں گی۔

اب ہم نے ہلہ بول دیا۔ جھونپڑوں کے قریب آکر ہم نے اکٹھے بہت سے فائر کھول دیے اور پھر جاپانی افسر نے کڑک کر چینی زبان میں کہا: "اگر کوئی اندر ہے تو فوراً باہر آجائے ورنہ اس کے بعد ہم اندر آکر کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔"

اور پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو صرف جنوں پریوں کی کہانیوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک تمام جھونپڑوں میں سے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئے بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اتنی بہت سی تعداد میں ایک دم باہر نکل آئیں جیسے وہ اسی حکم کے انتظار میں تھیں۔ آن کی آن میں ہمارے سامنے جھریوں بھرے چہرے، لٹکتی ہوئی جھلیوں اور بجھی ہوئی آنکھوں کی قطاریں تن گئیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ اس وقت کا سناٹا ہولناک تھا۔ ابھرتے ہوئے سورج کی وجہ سے ہم سب کے سائے ڈراؤنی حد تک لمبے ہو کر گھاس کے قطعوں پر جیسے لیٹ گئے تھے اور عورتیں زیر لب کوئی جاپ کر رہی تھیں۔ کچھ ایسی پراسرار فضا پیدا ہوگئی جیسے ابھی ابھی ایک پل میں چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر جائے گی اور الٹ کر سب کو سمندر میں گرادے گی۔

جاپانی افسر کے حکم سے ہم نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ پھر جاپانی لیڈر آگے بڑھا اور گرج کر بولا، "مرد کہاں ہیں؟"ایک لمحے تک خاموشی رہی جیسے توپ میں گولا بھرا جارہا ہے۔ پھر ایک بالکل سفید بالوں والی بڑھیا ایک قدم آگے آگئی اور بولی: "روز کے کام پر گئے ہیں۔"

"روز کے کام پر۔۔۔"لیڈر کڑکا،"یعنی جاپانی سرکار کی جڑیں کھودنے کے لئے چین کے ساحلوں پر فسادیوں کے اڈے بنانے؟"

"جی نہیں۔ ،،بڑھیا بولی،،، مچھلیاں پکڑنے!"

"اور بچے اور بوڑھے؟"افسر نے پوچھا:"اور تمہاری لڑکیاں؟"

"آج ہم مچھیروں کا سالانہ میلہ ہے۔"بڑھیا اسی انداز سے بول رہی تھی،"سب ادھر پانیوں میں خوشیاں منائیں گے اور۔۔۔"

"ادھر آؤ!"لیڈر نے بڑھیا کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کھینچا اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔ دوسرے افسر نے اس کی پیٹھ پر اپنے ریوالور کا فائر کر دیا۔ وہ چیخی اور یوں تڑپی جیسے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ پھر وہ چت گر پڑی اور دو ایک بار تن کر ٹھنڈی ہو گئی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جیسے ہم سب کو گھورنے لگی۔ سب عورتیں چہروں کو ہاتھوں سے چھپا کر رہ گئیں اور میں نے اپنے ہونٹ کے ایک گوشے کو اس زور سے کاٹا کہ کرچ سے میرے دانت میرے ہی گوشت میں اتر گئے۔ چڑیوں کے غول جو شاید پلٹ کر آئے تھے روتے ہوئے ہانگ کانگ کی طرف اڑ گئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والے سمندری پرندے کچھ یوں منتشر ہو کر ادھر ادھر اڑ گئے جیسے گولی انہی کے ہجوم میں سے گزری ہے۔ دور کے جھونپڑوں میں دو کتے بھونکنے لگے۔ ہم پنجابیوں کو عورتوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر جاپانی جھونپڑوں میں گھس گئے۔ خوب خوب اٹھا پٹخ کی اور گالیاں بکیں۔ میں چینی عورتوں کے چہروں کو باری باری دیکھتا رہا، اُن کی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی موت کے خوف سے یاجانے کس احساس سے کانپے جارہی تھی اور اُن کی ذرا ذرا سی آنکھیں کہیں دور ہٹ کر سوچ رہی تھیں۔ جاپانی جھونپڑوں سے نکل کر دور گول ساحل کی طرف چلے گئے تھے اور جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔

اچانک ایک عورت زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اوراپنا زیر لب جاپ جاری کر دیا مجھے اپنی ماں یاد آگئی۔ میں فورادوسری طرف دیکھنے لگا اور کچھ یوں ظاہر کیا جیسے میں اُن سب سے بے پروا ہو گیا ہوں۔ آنکھوں کے گوشوں میں سے میں نے دیکھا وہ عورت پھرزمین پر بیٹھ گئی اور دوسری عورتوں کی ٹانگوں میں چھپتی ہوئی آگے کھسکنے لگی۔ مردہ بڑھیا کے پاس آکر اس نے نہایت خوفزدہ انداز میں میری

طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے لاش کے چہرے پر ایک بڑا سا کپڑا پھیلا کر وہ پیچھے ہٹی اور اپنی جگہ پر آکر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ضبط کی کوشش کی، کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا مگر میری آنکھوں میں آنسو آہی گئے۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت تھوڑا سا آگے آکر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک گئیں اور اکٹھے بہت سے آنسو اس کی جھریوں میں ندیوں کی طرح بہہ کر پھیل گئے۔ سمندر کی ٹھنڈی نم آلود ہوا میرے کھلے گریبان سے فائدہ اٹھا کر میری پسلیوں میں پیوست ہوئی جارہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ میں نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا، اُن سب کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں بڑھیا کی لاش کی طرف دیکھنے لگا، ہوا کے جھونکے نے اس کے منہ پر سے کپڑا اڑا دیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا سر اٹھایا اور اس کے گرد کپڑا لپیٹ دیا۔

ایک جاپانی سپاہی چنگھاڑتا ہوا آیا اور میری کمر میں ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے سوا دوسری سب عورتوں نے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لیے اور میں کمر کی چوٹ کو سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ جاپانی سپاہی نے لاش کے سر پر سے کپڑا نوچ ڈالا۔ مری ہوئی بڑھیا کا ذرا سا سفید جوڑا کھل کر اس کے کھلے دھانے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پھیل گیا اور سب جاپانی واپس آگئے۔

دستے کے لیڈر نے عورتوں کے سامنے بڑے غصے سے ایک تقریر کی اور کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ ہانگ کانگ میں بھی تم لوگوں کا خفیہ گروہ کام کررہا ہے اور انہی میں سے کسی نے تمہیں ہمارے چھاپے کی خبر دی ہے۔ ورنہ یوں نوعمر لڑکیاں، بچے، جوان اور بوڑھے جزیرے پر سے غائب نہ

ہوتے۔ لیکن ہم یہاں سے جائیں گے نہیں۔ ہم آج سارا دن اُن کا انتظار کریں گے اور جب وہ آئیں گے تو تمہارے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں، بہنوں، شوہروں، بیویوں اور باپوں کو تمہارے سامنے گولیوں سے اڑا دیں گے اور پھر تمہیں بھی سمندر میں دھکیل دیا جائے گا۔"وہ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا اور آخر ہم جنگی قیدیوں کو ان نئے قیدیوں کی نگرانی پر مقرر کر کے سب جاپانی دور درختوں کے دائرے میں چلے گئے اور اپنے اپنے تھیلوں سے شراب کی بوتلیں نکال کر قہقہے مارنے اور ناچنے گانے لگے۔

عورتیں ہمارے حلقے میں بیٹھ گئیں۔ بادل گھر آئے تھے جن کی وجہ سے سورج غائب تھا۔ اتنی دیر بعد بھی وہی منہ اندھیرے کا منظر جاری تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا میرے سینے میں برمے کی طرح گھسی جارہی تھی۔ میں گریبان کے دونوں حصوں کو ملاتا تومیرا ہاتھ سن ہو جاتا اور جب چھوڑتا تو سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا۔ بڑھیاکی لاش کی موجودگی کے احساس سے بھی جسم کی کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتوں کا زیر لب جاپ جاری تھا۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے چہرے پر آنسوؤں کی بجائے زردی سنڈرہی تھی اور وہ منہ کھولے مجھے گھور ے جارہی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت جاری رہی۔ جب ایک جاپانی سپاہی ہمارے پاس آیا اور بولا کہ فی الحال ایک اور قریبی جزیرے پر جانے کا فیصلہ ہوا ہے اس لیے کچھ دیر کے بعد ادھر روانہ ہوں گے اور جب تک یہ عورتیں ہم سب کے لئے کھانا تیار کریں گی۔ اس نے عورتوں کو کھانا پکانے کا حکم دیا اور ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کا حکم دے کر واپس چلاگیا۔

عورتیں اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلی گئیں۔ بادل گرجنے لگا، ہوا میں جمی ہوئی برف کے ٹکڑے اڑنے لگے جو میرے سینے سے نکیلے پتھروں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور میں اپنے گھروندے کے اس گوشے کو یاد کررہا تھا

جس میں دبک کر ہم ماں بیٹا سردیوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ اپلوں کا دھواں ہمارا احاطہ کیے رکھتا تھا اور ماں بار بار میرے سینے پر اپنی چادر پھیلا کر کہتی تھی:"سینے کو سردی سے بچائے رکھو بیٹا، ہوا میں جو نمونیا ہوتا ہے وہ سینے ہی کی راہ پسلیوں میں اترتا ہے۔۔۔"

آنسوؤں میں بھیگا ہوا ماں کا چہرہ ایک مدت کے بعد بڑی وضاحت سے میرے سامنے ابھرا۔ جھریوں میں پھنسے ہوئے آنسو بجلی کی چمک سے جگمگا اٹھے تھے۔ جھلی کانپ رہی تھی اور یہ چہرہ میرے قریب آرہاتھا۔

وہ عورت جس نے لاش کا چہرہ ڈھانپا تھا، آہستہ آہستہ میری طرف آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اوروہ بار بار پلٹ پلٹ کر جاپانیوں کی طرف دیکھتی تھی جو دور ابھی تک ناچ اور گارہے تھے۔ اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی، بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت اُن کی جھریوں میں بھی آنسو پھیل رہے تھے۔ قریب آکررک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے بولی: "قیدی ہو؟"

میں زبان سے کچھ نہ بولا صرف اثبات میں سرہلادیا۔ وہ بولی،'' میرا بیٹا جلدی میں تھا، میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سنی، اس کی قمیص میں بھی تمہاری طرح ایک بھی بٹن نہ تھا۔ ''

میں چونکا۔

وہ بولتی چلی گئی:"تمہاری ماں ہے نا؟"

میں اب کے بھی کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سرہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر بچے کی طرح رونے لگا۔ وہ آگے بڑھ کر میری قمیص میں بٹن ٹانکنے لگی اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں

کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا اور میری قمیص سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی۔

اور میں ایک لمحے کے لئے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر کر الٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گرا پڑا ہوں !

﴿احمد ندیم قاسمی، سہ ماہی لوح، مدیر: ممتاز احمد شیخ، اردو بازار کراچی، شمارہ ۵ ۔۶، جون تا دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۶۹۔۱۷۵﴾

اشفاق احمد

امّی

وہ بڑے صاحب کے لئے عید کارڈ خرید رہا تھا کہ اتفاقاً اس کی ملاقات امی سے ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے امّی سے آنکھ بچا کر کھسک جانا چاہا لیکن اس کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے اور وہ اپنی پتلون کی جیب میں اکنی کو مسلتا رہ گیا۔ اچانک امّی نے اسے دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی، "او سودی، تم کہاں؟" اس نے فوراً اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا اور ایک عید کارڈ اٹھا کر بولا، "یہیں، امّی، میں تو یہیں ہوں۔"

"کب سے؟" امّی نے حیرت سے پوچھا۔

"تقسیم کے بعد سے امّی میں بھی یہاں ہوں اور ماں اور دوسرے لوگ بھی۔"

"لیکن مجھے تمہارا پتہ کیوں نہ چلا۔ میں نے تمہیں کہیں بھی نہ دیکھا۔"

اس کے جواب میں وہ ذرا مسکرایا اور پھر عید کارڈ کا کنارہ اپنے کھلے ہوئے ہونٹوں پر مارنے لگا۔ دکان کے لڑکے نے بڑے ادب سے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے میز پر پھیلے ہوئے دوسرے کارڈوں میں ڈال کر اندر چلا گیا۔ امّی نے اپنا پرس کھولتے ہوئے پوچھا: "اب تو تو اپنی ماں سے نہیں جھگڑتا؟"

مسعود شرمندہ ہو گیا۔ اس نے عید کارڈوں پر نگاہیں جما کر کہا: "نہیں تو۔۔۔ میں پہلے بھی اس سے کب جھگڑتا تھا۔" امّی نے کہا: "یوں تو مت کہہ۔ پہلے تو تو بات بات پر اس کی جان کھا جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فساد برپا کر دیتا تھا۔" اس نے صفائی کے طور پر امّی کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر جواب دیا: "جب تو میں چھوٹا سا تھا امّی۔ اب تو وہ بات نہیں رہی نا۔" لیکن اس جواب سے امّی کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے بات بدلتے

ہوئے کہا: "تیرا دوست تو یو۔ کے چلا گیا، انجینئرنگ کی تعلیم پانے۔ یہ عید کارڈ اسی کے لئے خرید رہی تھی۔"

"کہاں؟ انگلینڈ چلا گیا!" اس نے حیران ہو کر کہا، "جبھی تو وہ مجھ سے ملا نہیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا اسے کیا ہوا۔ یہاں ہوتا اور مجھ سے نہ ملتا۔ کیسی حیرانی کی بات ہے۔" امّی نے آہستہ سے دہرایا: "ہاں انگلینڈ چلا گیا۔ ابھی دو سال اور وہیں رہے گا۔ یہ عید کارڈ اسی کے لئے خریدا ہے۔" اور اس نے کارڈ آگے بڑھا دیا۔ اس پر غریب الوطنی، دوری اور ہجر کے دو تین اشعار لکھے تھے۔ مسعود نے اسے ہاتھ میں لیے بغیر کہا: "لیکن یہ عید تک اسے کیسے مل سکے گا۔ عید تو بہت قریب ہے۔" امّی نے وثوق سے کہا: "ملے گا کیسے نہیں۔ میں بائی ایئر میل جو بھیج رہی ہوں۔"

"لیکن بائی ایئر میل بھی یہ وقت پر نہ پہنچ سکے گا۔" مسعود نے جواب دیا۔ امّی نے کہا: "تو کیا ہے۔ اسے مل تو جائے گا۔ ایک آدھ دن لیٹ سہی۔" اور مسعود کے کچھ کہنے سے پیشتر امّی نے کہا: "کبھی ہمارے گھر تو آنا۔ تمہاری دیدی نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا ہے۔ ضرور آنا۔ عید پر چلے آنا۔ ہم اکٹھے عید منائیں گے۔" جب امّی مسعود کو اپنا پتہ لکھا کر چلنے لگی تو اس نے اپنا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا: "آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر لینا۔ میں اکثر دورے پر رہتی ہوں، لیکن عید کے روز میں ضرور گھر پر ہوں گی۔" مسعود نے پتے کے ساتھ ایک کونے پر فون نمبر بھی لکھ لیا۔ امّی نے ایک مرتبہ پھر اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا اور اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے دکان سے نیچے اتر گئی۔ مسعود نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اکنی کو چٹکی میں پکڑ لیا اور بڑے صاحب کے لئے عید کارڈ انتخاب کرنے لگا۔

مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے کسی دور کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔ اوّل اوّل تو اس کی دوسری شادی کا مقصد مسعود کی تعلیم و تربیت تھی لیکن اپنے دوسرے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اسے مسعود کو تقریباً بھلا دینا پڑا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں جب مسعود کو اپنے چچا سے فیس مانگنے

کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کئی دن یونہی ٹال مٹول میں گزار دیتا۔ پیسوں کے معاملے میں اس کی ماں بالکل معذور تھی۔ گھر کے معمولی اخراجات تک کے لئے اسے اپنے خاوند کا منہ تکتے رہنا پڑا اور وہ اپنی کم مائیگی اور تہی دستی کا غصہ مسعود پر اتارا کرتی۔ ہر صبح اسے چولہے کے پاس بیٹھ کر چائے کی پیالی اور رات کی ایک باسی روٹی کے ساتھ یہ فقرہ ضرور سننا پڑا، "لے مر لے۔ تیری خاطر مجھے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔"

یہ جملہ گو مسعود کو بہت ہی ناگوار گزرتا لیکن ہر روز ناشتے کے لئے یہ بل کچھ ایسا بڑا بھی نہ تھا اور فیس ادا کرنے کے دن تو اس بل میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا۔ اس کا چچا حقہ پیتے ہوئے کہتا: "پڑھتا وڑھتا تو ہے نہیں۔ یونہی آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ میں نے تیری ماں سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ تجھے ڈاکٹر بیگ کے یہاں بٹھا دیں تاکہ کچھ کمپاؤڈری کا کام ہی سیکھ لے۔ آگے چل کر تیرے کام آئے گا لیکن پتہ نہیں وہ کن خیالوں میں ہے۔" مسعود دونوں بانہیں سینے کے ساتھ لگا کر آہستہ سے جواب دیت: "کام تو اچھا ہے جی، لیکن پہلے میں دسویں پاس کر لوں پھر۔۔۔" اور چچا صاحب طنز سے مسکرا کر ایک باچھ ٹیڑھی کر کے بیچ میں بول اٹھتے، "بس بس جیسی کو کو ویسے بچے! یہی بات تیری ماں کہا کرتی ہے۔ اسے جب معلوم ہوا گر خود کما کر تیری روز روز کی فیسوں کی چٹی بھرے، کتنی فیس ہے تیری؟"

مسعود ذرا سہم کر جواب دیتا، "چار روپے تیرہ آنے جی!"

"اچھا اس مرتبہ تیرہ آنے کا اضافہ ہو گیا۔"

"کھیلوں کا چندہ ہے جی! ماسٹر جی نے کہا تھا کہ۔۔۔"

"تو کہہ دے اپنے ماسٹر واسٹر سے کہ میں کھیل نہیں کھیلتا اور تجھے شرم نہیں آتی کھیلیں کھیلتے ہوئے۔ اونٹ کی دم چومنے جتنا ہو گیا ہے اور کھیلیں کھیلتا ہے۔"

مسعود آہستہ سے کھنکار کر جواب دیتا: "میں تو کچھ نہیں کھیلتا جی، پر ماسٹر جی کہتے ہیں کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دینا پڑے گا۔"

"یہ اچھا رواج ہے۔" اس کا چچا سر ہلا کر کہتا، "کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دو۔ سکول ہے کہ کمشنر کا دفتر۔ چندہ نہ ہوا، وار فنڈ ہوا۔"

چونکہ عام طور پر ایسی بات کا جواب مسعود کے پاس نہ ہوتا، اس لیے وہ خاموش ہی رہتا۔ اس کے بعد چچا پاس ہی کھونٹی پر لٹکتی ہوئی اچکن سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر کہتا: "لے پکڑ۔ اپنی ماں کو بتا دینا اور سکول سے لوٹتے ہوئے باقی کے تین آنے مجھے دفتر دے جانا۔"

خوف، نفرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات سے مسعود کی آنکھیں پھٹتیں، بند ہوتیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتیں اور وہ نوٹ اپنی مٹھی میں دبا کر ماں کو بتانے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتا اور اس کا چچا اپنے کمرے میں حقہ بجاتے ہوئے ہانک لگاتا، "فیس دے دی ہے جی تمہارے شہزادے کو۔ ڈپٹی صاحب کو!" یہ سنتے ہی مسعود ایک دم رک جاتا اور جی ہی جی میں اپنی ماں کو ایک گندی سی گالی دے کر وہ الٹے پاؤں اپنی کوٹھری میں جا کر بستہ باندھنے لگتا۔ چچا جیسے بیہودہ آدمی سے شادی کر کے اس کی ماں اس کی نگاہوں میں بالکل گر چکی تھی اور وہ چچا کی طعن آمیز باتوں کا بدلہ ہمیشہ اپنی ماں کو گالی دے کر چکایا کرتا۔

تفریح کی گھنٹی میں درختوں کے سائے تلے اپنے کھیلتے ہوئے ہم جولیوں کی دعوت سے انکار کر کے اسے سیدھا گھر بھاگنا پڑتا۔ خاصہ دان تیار ہوتا جسے اٹھا کر وہ جلدی جلدی اپنے چچا کے دفتر پہنچتا اور اسے اُن کی کرسی کے پاس رکھ کر بغیر کچھ کہے سکول بھاگ آتا۔ عرصہ سے اس کی تفریحی گھنٹیاں یونہی ضائع ہو رہی تھیں۔ صرف اتوار کے دن اسے اپنے چچا کے دفتر نہ جانا پڑتا، لیکن اتوار کو کوئی تفریح کی گھنٹی نہیں ہوتی۔

آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحان سے پہلے اس کے یہاں ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا جس کا نام اس کی ماں کے اصرار کے باوجود مقصود کی بجائے نصر اللہ رکھا گیا۔ اس بھائی کی پیدائش نے مسعود سے اس کی ماں کو قطعی طور پر چھین لیا اور اس کی حیثیت گھر

میں کام کرنے والے نوکر سی ہو کر رہ گئی، جو اپنا اصلی کام ختم کرنے کے بعد پڑوس کے دروازے کی اونچی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بچے کھلایا کرتا ہے۔ نصر اللہ کی آمد کے دن سے مسعود کا چچا دن میں بارہا ڈاکٹر بیگ کا وظیفہ کرنے لگا اور مسعود کی ماں سے تقاضا کرتا رہا کہ چونکہ اب نصر اللہ ہو گیا ہے، اس کے اخراجات بھی ہوں گے، اس لیے مسعود کو سکول سے اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں بٹھا دینا چاہیے لیکن اس کی ماں نہ مانی اور سلسلہ یونہی چلتا رہا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسعود کے سکول میں موسم کے طلسماتی کارڈ بیچنے ایک آدمی آیا اور اس کی وجہ سے مسعود کی ملاقات امّی سے ہوئی۔ گلریز اپنی بیوہ امّی کا ایک ہی لڑکا تھا اور مسعود کا ہم جماعت تھا۔ جماعت بھر میں مسعود کی دوستی صرف گلریز سے تھی۔ دونوں کو ننھی ننھی ٹوکریاں بنانے کا خبط تھا۔ پڑھائی کے دوران میں اگر کبھی انہیں فرصت کے چند لمحات میسر آجاتے تو وہ سائنس روم کے دروازوں سے چمٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں سے ادھ سوکھی لمبی لمبی رگیں توڑتے اور کھیل کے میدان میں ہری ہری گھاس پر ٹوکریاں بنانے لگتے، جس میں گلاب کا ایک پھول یا چنبیلی کی چند کلیاں مشکل سے سما سکتیں۔ مسعود دستی والی ٹوکری بھی بنا لیتا تھا لیکن گلریز سے ہزار کوششوں کے باوجود بھی ایسی ٹوکری نہ بن سکتی تھی اور وہ مسعود کی بنائی ہوئی ٹوکری لے لیا کرتا۔

ہاں تو جس دن اُن کے سکول میں موسم کے طلسماتی کارڈ بیچنے والا آدمی آیا، مسعود کی ملاقات امّی سے ہوئی۔ سفید کارڈوں کے بیچوں بیچ گلابی رنگ کا ایک بڑا سا سرخ دائرہ تھا، جس پر ایک خاص مصالحہ لگا ہوا تھا۔ کارڈ بیچنے والے نے بتایا کہ جیسے جیسے موسم تبدیل ہوتا رہے گا، اس دائرے کے رنگ بھی بدلتے رہیں گے۔ جوں جوں گرمی بڑھتی جائے گی، گلابی دائرہ سرخ ہوتا جائے گا اور جب سردی کا زور ہو گا تو یہ گلابی چکر بسنتی رنگ کا ہو جائے گا اور جس دن مطلع ابر آلود ہو گا اور بارش برسنے کا امکان ہو گا تو یہ چکر خود بخود دھانی رنگ کا ہو جائے گا۔ کارڈ کی قیمت دو آنے تھی۔ کلاس میں تقریباً

سب نے وہ کارڈ خریدے اور جن کے پاس دو آنے نہ تھے، اُنھوں نے بات اگلے دن پر اٹھادی۔

گھر سے خاصہ دان اٹھاتے ہوئے مسعود نے ہولے سے کہا: "اماں، مجھے دو آنے تو دو میں۔۔۔" مگر اس نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا: "میرے پاس کہاں ہیں دو آنے۔ کبھی مجھے پیسے چھوتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ کون لالا کے میری جھولیاں بھرتا ہے جو تجھے دونی دوں۔"

مسعود نے مایوس ہو کر خاصہ دان اٹھالیا اور چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا۔۔۔ دفتر پہنچ کر اس نے خاصہ دان کرسی کے پاس رکھ دیا اور خلاف معمول وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس کے چچا نے فائل میں کاغذ پروتے ہوئے عینک کے اوپر سے دیکھا اور ترش رو ہو کر پوچھا: "کیوں؟ کھڑا کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔" مسعود کا گلا خشک ہو گیا۔

"کچھ تو ہے۔"

"نہیں جی کچھ بھی نہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"تو پھر فوجیں کیوں کھڑی ہیں؟"

"جی ایک دونی چاہیے۔۔۔ اماں۔۔۔ میں۔۔۔ سکول میں جی۔۔۔ ماں۔۔۔"

"بلوں ماں" اس کے چچا نے غرا کر کہا: "تجھے دونی دوں! تجھے ناواں دوں! میرے بورے جو ڈھوتا رہا ہے۔ میرے ساتھ جو کھیلتا رہا ہے۔"

مسعود شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا: "میں میں۔۔۔ اماں نے۔۔۔ اماں نے۔۔۔ جی سکول۔۔۔ سکول میں۔۔۔"

"ہوں۔" اس کے چچا نے گرج کر کہا: "تجھے پیسے دوں! تجھے دونیاں دوں۔ کیوں؟ مجھے بین سنا تا رہا ہے۔ مجھے نبض دکھا تا رہا ہے۔ تجھے پیسے دوں۔ ہوں تجھے دونی دوں۔۔۔ تجھے۔۔۔"

مسعود نے ایک نگاہ خاصہ دان کو غور سے دیکھا جو واقعی ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا اور پھر اپنے چچا کو اسی طرح ہوں ہوں کرتے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کھپریل کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھا چپراسی آپ ہی آپ کہے جا رہا تھا، "ہوں! تجھے پیسے دوں! تجھے ناواں دوں۔ میرے بورے جوڈھوتا ہے۔ ہوں تجھے پیسے دوں۔"

اور راستہ بھر مسعود کو ایسی ہی آوازیں آتی رہیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے ٹخنوں کے درمیان چھوٹا سا گراموفون لگا ہوا ہو اور جس کا ریکارڈ اس کی رفتار کے مطابق گھومتا ہو۔ مسعود نے سڑک کے کنارے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا اور ریکارڈ اونچے اونچے بجنے لگا: "تجھے پیسے دوں، تجھے پیسے دوں، میرے بورے جو میرے بورے جو۔" مسعود نے گھبرا کر راہ چلتے لوگوں کو غور سے دیکھا کہ وہ بھی تو یہ ریکارڈ نہیں سن رہے اور پھر اپنی رفتار بالکل سست کر دی۔ گراموفون کی چابی ختم ہو گئی اور ریکارڈ سسکنے لگا، "تجھے پیسے۔۔۔ دوں۔۔۔ تجھے ناواں۔۔۔ دوں۔۔۔ میرے۔۔۔ بورے۔۔۔ جو۔۔۔" اور سکول تک یہ باجا یونہی بجتا رہا۔

سکول بند ہونے پر گلریز نے خود ہی اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی کہ طلسماتی کارڈ اپنے کمرے میں لٹکا کر اور سارے دروازے بند کر کے دیکھیں گے کہ گرمی سے دائرہ سرخ ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ تجسس مسعود کو کشاں کشاں اُن کے گھر لے گیا۔ گول گول غلام گردش والے برآمدے کے ایک کونے میں سفید رنگ کی ساڑھی باندھے ادھیڑ عمر کی ایک دبلی سی عورت جالی کے دروازے کو دھاگے سے ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا اور کندھوں پر سلیٹی رنگ کی بنی ہوئی ایک اونی شال پڑی تھی۔ مسعود نے ایک نظر اس کے ننھے سے وجود کو دیکھا جس سے سارا برآمدہ بھرا بھرا

معلوم ہوتا اور سیڑھیوں پر ٹھٹک گیا۔ اسے اس طرح دم بخود دیکھ کر گلریز نے بے تکلفی سے بستہ چارپائی پر پھینک کر کہا: "آؤ۔ آؤ۔"

اور پھر سیمنٹ کے فرش پر تیزی سے اپنے بوٹ گھسیٹتا وہ اس عورت کے پاس جا کھڑا ہوا اور چلانے لگا: "امّی امّی! میں نے ایک چیز خریدی۔ ایک نئی چیز، جادو کا کارڈ۔۔۔ دیکھو امّی۔" اور اس کی امّی نے گردن موڑ کر اور کارڈ ہاتھ میں لے کر کہ: "اچھا ہے۔ بڑا اچھا۔" اور پھر اس کی نگاہیں برآمدے میں رینگتے ہوئے اس لڑکے پر پڑیں، جس نے ٹخنوں سے اونچی میلی شلوار پہن رکھی تھی اور جس کی خاکی کینوس کے جوتوں سے اس کی انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ گلریز نے شرماتے ہوئے کہ: "یہ میرا دوست مسعود ہے۔ امّی یہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ یہ میرے ساتھ اس کارڈ کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھنے آیا ہے۔" امّی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غور سے مسعود کو دیکھا۔ خوش آمدید کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ بڑے پیار سے بولی: "تم نے کارڈ نہیں خریدا مسعود؟"

اور مسعود کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کی برسوں کی واقف ہو۔ مسعود اس کے صحن میں کھیل کر اتنا بڑا ہوا ہو اور وہ مسعود کو لمبی لمبی کہانیاں سنا کر ہر رات کہا کرتی رہی ہو، "اب تم سو جاؤ۔"

گلریز نے اپنے کارڈ کے دائرے پر فخر سے انگلی پھیرتے ہوئے کہا: "اس نے نہیں خریدا امّی۔ اس کے پاس دونی نہیں تھی۔ اس کے پاس کبھی بھی پیسے نہیں ہوئے۔" امّی نے کہا: "تو اچھا دوست ہے۔ اس نے نہیں خریدا تو تو نے دو کارڈ کیوں نہ خرید لیے؟ تیرے پاس تو پیسے تھے۔" گلریز نے گھبرا کر جواب دیا: "باقی پیسوں کی تو میں نے برفی کھالی تھی اور ایک آنے کی پنسل خریدی تھی۔" امّی نے کہا: "تو تجھے اپنے دوست سے برفی پیاری ہے۔"

"نہیں جی۔ امّی۔" گلریز شرمندہ ہو گیا اور اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ کے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں سرخ رنگ کے صوفے پر ایک لڑکی سویٹر بن رہی

تھی۔ اس کے پہلو میں چینی کی ایک چھوٹی سی رکابی میں کھلیں پڑی تھیں۔ گلریز نے اندر داخل ہو کر کہا، "دیکھو، دیدی، دیکھو، میرے پاس جادو کا کارڈ ہے۔"

اور دیدی نے سلائیوں سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا: "اچھا ہے۔" مسعود دیدی کا رویہ دیکھ کر باادب ہو گیا اور گلریز خفیف ہو کر جالی کا دروازہ زور سے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ دیدی نے ماتھا سکیڑ کر کہا: "آہستہ" اور پھر سوالیہ نگاہوں سے مسعود کو دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ مسعود نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہولے سے آگے بڑھا۔ دھیرے سے جالی کا دروازہ کھولا اور اسے بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ بند کرتے ہوئے گلریز کے پیچھے چلا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر گلریز نے کارڈ میز پہ ڈال کر کہ: "دروازہ بند کرو یار۔ کمرہ گرم ہو جائے گا تو کارڈ رنگ بدلے گا۔" دروازہ بند ہو گیا۔ وہ دیر تک کارڈ پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہے مگر اس کا رنگ تبدیل نہ ہوا۔ مسعود نے کہا: "گلریز میاں، گرمی کم ہے اس لیے رنگ تبدیل نہیں ہوتا۔ باورچی خانے میں چولہے کے پاس کارڈ رکھیں گے تو یہ ضرور سرخ ہو جائے گا۔"

جب باورچی خانے میں پہنچے تو امّی گوبھی کاٹ رہی تھیں۔ گلریز نے ایک چوکی چولہے کے پاس کھینچ کر اس پر کارڈ ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا رنگ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا۔

امّی سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ اسے پھلوں اور بسکٹوں والی چائے پلا کر گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں تو باورچی خانے سے چرائی ہوئی چونی مسعود کی جیب میں انگارے کی طرح دہکنے لگی اور وہ جلدی سے سلام کر کے اُن کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس دن کے بعد سے امّی نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا او وہ سارا دن اُن کے گھر ہی رہنے لگا۔

تقسیم کے بعد جہاں سب لوگ تتر بتر ہو گئے، وہاں امّی اور مسعود بھی بچھڑ گئے اور پورے تین سال بعد آج اُن کی ملاقات عید کارڈوں کی دکان پر ہوئی تھی۔ مسعود نے اپنی کوٹھری تو نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ دفتر کے بعد کا تقریباً سارا وقت امّی کے

یہاں گزارنے لگا۔ دیدی نے واقعی ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ متکبر ہو گئی تھی۔ بریکٹ پر ایک بڑے سے پھول دان میں وہ سرکنڈوں کے پھول لگائے موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتی۔ اس کی آواز جو پہلے نرگس کے ڈنٹھل کی طرح ملائم تھی، خشک اور کھردری ہو گئی تھی۔ یوں تو وہ دن بھر میں مشکل سے ہی چند جملے بولتی لیکن جب بات کرتی تو یوں لگتا گویا خشک اسفنج کے ٹکڑے اگل رہی ہو۔ امّی جب بھی اس سے بات کرتی، بڑے ادب اور رکھ رکھاؤ سے کام لے کر۔ واقعی دیدی نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا۔

امّی نے کئی مرتبہ مسعود سے اس کی ماں اور چچا کے بارے میں پوچھا، لیکن اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ "یہیں کہیں رہتے ہیں۔ مجھے علم نہیں۔"

دفتر سے فارغ ہو کر مسعود سیدھا امّی کے یہاں پہنچتا اور رات کو دیر تک ادھر ادھر کی بے معنی گپیں ہانکتا رہتا۔ دیدی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی۔ وہ دو تین مرتبہ تیز تیز نگاہوں سے امّی اور مسعود کو گھورتی اور پھر ٹھپ سے کتاب بند کر کے اندر کمرے میں چلی جاتی۔ جب دیدی مسعود کی پہنچ سے باہر ہو جاتی تو وہ زور زور سے قہقہے لگا کر اس کی پڑھائی میں مخل ہونے لگتا۔ امّی کو پتہ تھا کہ وہ جان بوجھ کر دیدی کو تنگ کر رہا ہے، لیکن اس نے کبھی بھی مسعود کو منع نہیں کیا۔ ایک رات جب اسے باتیں کرتے کرتے کافی دیر ہو گئی تو امّی نے کہا: "اب یہیں سو رہو۔ اس وقت اتنی دور کہاں جاؤ گے۔" تو مسعود وہیں سو رہا اور اس رات کے بعد وہ مستقل طور پر اسی کے یہاں رہنے لگا۔

چچا کی بخیل فطرت اور ماں کی لاپروائی اس کی آزادانہ زندگی پر ایک عجیب طرح سے اثر انداز ہوئی۔ وہ پہلے جس قدر گم صم رہتا تھا، اب اسی قدر ہنسوڑ ہو گیا تھا اور اپنے بچپن کی غریبی کا مداوا کرنے کے لئے اس نے جو اکھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی وہ تنگ و تاریک کوچوں میں سے گذرتا ہوا اس اندھی گلی میں پہنچ جاتا

جس کے آخر میں پرانے چھپر اور پھونس کے ڈھیر پڑے ہوتے۔ پھونس کو ایک طرف ہٹا کر مسعود اندھیرے بھٹ میں داخل ہوتا جس کے پیچھے کچی اینٹوں کی ایک غلیظ سی کوٹھری، کڑوے تیل کا دیا اپنی آغوش میں لیے اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ چیتو، بھمبیری اور ڈھلن نشہ پانی کیے فرش پر لیٹے ہوتے اور ریباں چھوٹے سے دروازے کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے پشت لگائے ہولے سے کہتی: "آ گیا، راجہ نل آ گیا۔" اور پریل شروع ہو جاتی۔ مسعود کا ذہن اور مقدر مل جل کر ایسے ایسے معرکے مارتے کہ ہارنے کی نوبت کم آتی اور جب تک مسعود کی جیبیں خالی نہ ہو جاتیں اسے کل نہ پڑتی۔ وہ تاش پھینٹے جاتا، نقدی کی ڈھیریاں لگائے جاتا اور پریل کھیلے جاتا حتیٰ کہ اس کے مخالفوں کے پاس ایک چھدام بھی نہ رہتا یا اس کی جیبوں کا استر مردہ گائے کی زبان کی طرح باہر لٹکنے لگتا۔

امّی کو پتہ تھا کہ مسعود نوکر ہو کر بڑا ہی زندہ دل اور چست ہو گیا ہے لیکن اس بات کا اسے علم نہ تھا کہ پریل کھیلتے ہوئے اس کی انگلیاں بھی قینچی کی طرح چلنے لگتی ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو امّی اس کا بستر بچھا کر آدھی رات تک اس کا انتظار کرتے ہوئے سوچا کرتی کہ گلریز بھی یونہی آوارہ گردی کرتا ہو گا اور اس کی لینڈ لیڈی اس کا انتظار اسی طرح کیا کرتی ہو گی۔ پھر مسعود اور گلریز آپس میں گڈمڈ ہو جاتے۔ امّی اور لینڈ لیڈی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں اور شفقت لاابالی کا انتظار کرنے لگتی۔ دیدی اپنے بستر پر ایک دو مصنوعی کروٹیں بدل کر آتش بار نگاہوں سے امّی کو گھورتی اور پھر منہ دوسری طرف کر کے دم سادھ لیتی۔ مسعود جب پھاٹک کے قریب پہنچتا تو پنجوں کے بل چلنے لگتا۔ شور مچانے والے پٹ کو آہستہ سے دھکیلتا اور پھر اندر داخل ہو کر اسے اسی طرح بند کرنے لگتا کہ امّی پکار کر پوچھتی:

"کہاں سے آئے ہو؟"

"کہیں سے نہیں امّی۔" وہ سہم جاتا۔

"نہر پر دوستوں کے ساتھ گپیں مار رہا تھا۔"

"یہ تمہارے کون سے ایسے دوست ہیں ذرا میں بھی تو دیکھوں۔"

"میرے دفتر کے ساتھی ہیں امّی۔ دفتر کی باتیں ہو رہی تھیں۔" اور وہ آرام سے آکر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور اپنے بوٹ کھولنے لگتا۔ امّی خاموشی سے اٹھ کر اندر آجاتی اور کٹ کیٹ کا پیکٹ اس کے بستر پر پھینک کر بے پروائی سے کہت: "میں آج بازار گئی تھی اور تیرے لیے یہ لائی تھی۔ آدھی اپنی دیدی کے لئے رکھ لینا۔" اور جب وہ بستر پر لیٹنے لگتا تو امّی کہتی: "یہ تو اپنے بالوں پر اتنا تیل کیوں تھوپ لیتا ہے۔ لے کے سارے تکیے تیلی کی صدری بنا دیے ہیں۔ صبح ہونے دے تیرے سر پر استرا پھروا تی ہوں۔" اور مسعود کوئی جواب دیے بغیر سفید چادر اوڑھ کر مردے کی طرح سیدھا شہتیر لیٹ جاتا تو امّی جل کر کہتی: "تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے یوں نہ لیٹا کر۔ یا تو کروٹ بدل یا ٹانگوں میں خم ڈال۔ اس طرح لیٹنے سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔" مسعود کروٹ بدل کر سو جاتا اور لینڈ لیڈی اطمینان کی سانس لے کر لباس تبدیل کرنے چلی جاتی۔

امّی گلریز کا ہر خط مسعود کو ضرور دکھاتی اور پھر اتنی مرتبہ اس سے پڑھوا کر سنتی کہ مسعود کو الجھن ہونے لگتی اور وہ خط پھینک کر باہر چلا جاتا۔ گلریز کے ہر خط میں یا تو روپوں کا مطالبہ ہوتا یا گرم کپڑوں اور دیگر معمولی معمولی چیزوں کا جن کا بندوبست امّی بڑے انہماک سے کیا کرتی۔ پارسل سیے جاتے۔ ان پر لاکھ کی مہریں لگتیں اور پھر مسعود کو انہیں ڈاک خانے لے جانا پڑتا۔

تنخواہ ملنے میں ابھی کئی دن پڑے تھے۔ بھمبیری مسعود کو سڑک پر مل گیا۔ اس نے بتایا کہ اُن کی چوکڑی میں ایک بڑا مال دار کباڑیار کنا داخل ہو گیا ہے جو صرف ہزاروں کی بازی لگاتا ہے۔ مسعود کے استفسار پر بھمبیری نے بتایا کہ وہ ہر روز اپنے ایک گماشتے لالو کانے کے ساتھ گپھا میں آتا ہے اور نشہ پانی کر کے چلا جاتا ہے۔ مسعود نے ڈاک خانے کے پچھواڑے جا کر گرم سوٹ کا پارسل کھولا اور ماسٹر غلام حسین کی دکان پر جا کر ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیا۔ اس رات وہ گھر نہیں گیا۔ اس کا بستر تمام رات ٹھنڈا رہا اور اس کی پائنتی پر پڑی سفید چادر امّی کی طرح ساری رات اس کا انتظار کرتی

رہی۔ صبح جب وہ گھر پہنچا تو نہ اس کے پاس روپے تھے اور نہ پارسل کی رسید۔ امّی نے رات بھر غائب رہنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیے بغیر اس سے پوچھا: "پارسل کروادیا تھا؟"

"کروادیا تھا۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"اور رسید؟" دیدی نے پوچھا۔

مسعود نے گھور کر دیدی کو دیکھا اور کہا: "رات میں جس دوست کے یہاں سویا تھا رسید وہیں رہ گئی۔"

امّی نے چائے کی پیالی بناتے ہوئے پوچھا: "چھ روپے میں کام بن گیا تھا۔"

"نہیں۔" مسعود نے آہستہ سے کہا: "ساڑھے سات روپے کے ٹکٹ لگے۔ میں نے ڈیڑھ روپیہ ادھار لے لیا تھا۔" اور ڈیڑھ کا لفظ آتے ہی چائے اس کے حلق میں پھنس گئی۔ مسعود کو معلوم تھا امّی کی تنخواہ تین چار سو کے لگ بھگ ہے۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ایک پارسل کے نہ پہنچنے سے وہ مر نہیں جائے گی۔ ایک دن جب دیدی کے ڈریسنگ ٹیبل سے پچیس روپے گم ہو گئے تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس نے بلا سوچے سمجھے امّی سے کہہ دیا کہ یہ کارستانی مسعود کی ہے۔ امّی بجائے خفا ہونے کے رو کر کہنے لگی: "آج تو مسعود پر الزام دھرتی ہے کل مجھے چور بتائے گی۔۔۔ وہ بھلا تیرے پیسوں کا بھوکا ہے؟" لیکن دیدی نہ مانی اور ماں بیٹی میں خوب خوب تکرار ہوئی۔ شام کو نہ امّی نے کھانا کھایا اور نہ دیدی نے، لیکن اس رات مسعود کا پانسہ بھاری رہا اور اس نے اپنے ساتھ بھمبیری اور چیتو کو بھی نان کباب کھلائے۔

گلریز کا خط آگیا تھا کہ اسے پارسل نہیں ملا۔ ڈاک خانے میں پوچھ گچھ ہوئی۔ رسید کی ڈھنڈیا پڑی لیکن نہ رسید ملی نہ پارسل کا پتہ چلا اور امّی ڈاک خانے کو روپیٹ کر خاموش ہو رہی، لیکن اس مرتبہ نہ تو اس نے گلریز کا خط مسعود کو دکھایا اور نہ ہی اس

سے پڑھوا کر سنا۔ اس نئے رویے نے مسعود کو یونہی تجسس میں ڈال دیا۔ اس نے ایک دو مرتبہ امّی سے خط کے بارے میں پوچھا بھی لیکن وہ یہی کہہ کر خاموش ہو گئی کہ "میں کہیں ڈال کر بھول گئی ہوں۔" خط گھر ہی میں تو تھا، جاتا کہاں، مسعود کی تفتیش نے اسے امّی کی میز سے ڈھونڈ نکالا۔ گلریز نے لکھا تھا، "پارسل مجھے نہیں ملا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ یہاں سردی بڑھتی جارہی ہے اور میں سخت پریشان ہوں لیکن سب سے بڑی پریشانی روپے کی ہے۔ مجھے نئی کلاس میں داخلہ لینا ہے جس کے لئے مجھے کم از کم دو ہزار روپوں کی ضرورت ہو گی، لیکن امّی تم یہ دو ہزار روپیہ کہاں سے لاؤ گی۔ مجھے علم ہے کہ تمہارے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ پر میں کروں بھی تو کیا! تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک ہی ڈگری لے کر آجاؤں۔۔۔"

اس کے آگے مسعود نے کچھ نہ پڑھا۔ خط تہہ کیا اور دراز میں رکھ کر دفتر چلا آیا۔ اسے امّی کی تنخواہ کے بارے میں علم تھا اور اس کے اندوختہ کے متعلق بھی اندازہ تھا لیکن گلریز کے اس خط نے اس کے سارے اندازوں پر پانی پھیر دیا۔ سارا دن وہ بے شمار ننھے ننھے سوالوں میں گھر اٹائپ کرتا رہا اور آخر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ امّی نے گلریز کو بھی دھوکے میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ وہ غیر ملک میں عیاشیوں پر نہ اتر آئے۔ شام کو وہ معمول سے پہلے گھر پہنچ گیا۔ پھاٹک پر ٹانگہ کھڑا تھا۔ دیدی کہیں باہر گئی ہوئی تھی اور امّی اندر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ مسعود دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ امّی اپنے بڑے سیاہ ٹرنک سے زیور نکال نکال کر انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور پھر اپنے پرس میں ڈالے جاتی۔ ٹرنک بند کر کے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے سنہری انگوٹھی اتار کر بھی اسی پرس میں ڈال لی۔ جب وہ اٹھ کر چلنے لگی تو مسعود نے اندر داخل ہو کر کہا: "کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟"

امّی گھبرا گئی۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے کام لیتے ہوئے کہا: "اچھا ہی ہوا تم آگئے۔ میں بازار جارہی تھی۔ تھوڑا سا کپڑا خریدنا ہے۔ تم گھر پر ہی رہنا تمہارے لیے کٹ کیٹ لاؤں گی۔" مسعود نے کہا: "امّی ہمیں تو آج اس لیے جلدی چھٹی ہو گئی ہے کہ ہمارے دفتر کی ٹیم ریلوے کلب سے فٹ بال کھیل رہی ہے اور میں چھاؤنی جارہا

ہوں۔ میں گھر پر رہ کر کیا کروں گا۔ دینو جو یہاں موجود ہے۔" امّی نے کہا: "اسے میں ساتھ لیے جا رہی تھی لیکن خیر اب وہی گھر پر رہے گا۔۔۔ تم چائے پی لینا۔ تمہارے لیے انڈے ابال کر میں نے تھرموس میں رکھ دیے ہیں۔"

امّی چلی گئی۔ مسعود نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور خود کرسی پر دراز ہو کر اخبار دیکھنے لگا۔ دینو چائے تپائی پر رکھ کر تمباکو لینے چلا گیا۔ مسعود نے اسی طرح اخبار گود میں ڈالے ایک پیالی پی۔ تھرموس کھول کر ایک انڈا نکالا اور بغیر نمک لگائے کھا گیا۔ دینو کو بازار گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کے لوٹ آنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ مسعود اٹھا۔ دیدی کے ٹرنک سے کروشیا نکالا اور امّی کے کمرے میں جا کر اٹیچی کیس کھولنے لگا۔ اوپر ہی قرمزی رنگ کی ایک ریشمی ساڑھی کی تہہ میں پچاس روپے پڑے تھے۔ روپے اٹھا کر اس نے جیب میں رکھ لیے اور پھر تالا بند کرنے لگا، لیکن زنگ آلود پھاٹک کے کھلنے پر وہ چونک پڑا اور گھبراہٹ میں کروشیا بھی جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔ مسعود نے دینو کو گھورتے ہوئے پوچھا: "اتنی دیر کر دی تھی۔ کہاں چلا گیا تھا؟"

"جانا کہاں تھا؟" دینو نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا: "بنا بنایا تمباکو دکاندار کے پاس تھا نہیں، میں اگلی دکان پر گڑ لینے چلا گیا۔"

"اچھا" مسعود نے بے پروائی سے کہا: "امّی سے کہہ دینا میں ذرا دیر سے آؤں گا اور کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

سپرنٹنڈنٹ کے یہاں پہنچ کر مسعود نے اپنے چہرے پر مسکینی کے ایسے آثار پیدا کیے کہ وہ پسیج گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر ڈیڑھ سو روپیہ لا کر مسعود کو دے دیا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگا: "مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ دو سو روپے اس وقت میرے پاس نہیں۔ شاید یہ رقم تمہاری والدہ کو موت کے منہ سے بچا سکے۔" اور جب مسعود اٹھ کر جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا: "جنرل وارڈ کے انچارج ڈاکٹر قدیر میرے واقف ہیں۔ کہو تو اُنھیں ایک رقعہ لکھ دوں۔" مسعود نے تشکر آمیز لہجے میں

کہا: "اگر ایسا کر دیجئے تو میری دنیا بن جائے۔ خواجہ صاحب میرا اس جہاں میں سوائے میری ماں کے اور کوئی نہیں۔"

سپرنٹنڈنٹ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تمہاری والدہ راضی ہو جائے گی۔" اور جب مسعود رقعہ لے کر بنگلے سے نکلا تو رات چھا چکی تھی اور سڑکوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور سڑکوں پر یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ نو بہار ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا اور پھر ریلوے اسٹیشن پر چلا گیا۔ شرفاء کے کمرے میں جا کر اس نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور دیر تک آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ جب وہ اسٹیشن سے نکلا تو نو بج چکے تھے۔ اس نے ٹانگہ باغ کے قریب چھوڑ دیا اور پیدل چلنے لگا۔ سڑکوں کی چہل پہل کم ہونے لگی۔ سیر کرنے والوں کی ٹولیاں باغ سے نکل کر خراماں خراماں گھروں کو جا رہی تھیں۔ چوراہوں کے سنتری جا چکے تھے اور سینماؤں کے سامنے کی رونق اندر ہال میں سمٹ گئی تھی۔ مسعود نے اندھیری گلی میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر پھونس اٹھا کر گپھا میں داخل ہو گیا۔ ریباں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سلفہ بھرے سگریٹ کا دم لگا کر بولی: "آ گیا راجہ نل آ گیا۔"

رکنے کباڑیے نے کھنکار کر کہا: "آنے دو۔ آگے کون سے ننگ بیٹھے ہیں۔" لالو نے اپنی کانی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "لال اوئے۔ پہلی تاریخ سے پہلے کیسے درشن دیے۔ ابھی تو چاند چڑھنے میں کافی دیر ہے" مسعود مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ چیتو نے کہا: "لے، بھمبیری، چاند مکھن، چاند ہیرا۔ چاند چڑھ گیا چڑھ گیا۔ نہ چڑھا نہ چڑھا، نشہ جو ہوا۔" اس پر سب ہنسنے لگے۔

جب مسعود جوتا اتار کر دری پر بیٹھ گیا تو رکنے نے پوچھا: "پھر کچھ ہو جائے چھوٹی سی بازی؟"

"لے واہ، چھوٹی کیوں لالا۔" کانے نے کہا: "بازی ہو تو اگڑ بم ہو، نہیں تو نہ سہی۔" رکنا بولا: "ہم تو اگڑ بم ہی کھیلتے ہیں، لیکن بابو ذرا نرم ہے، اس لیے لحاظ کرنا ہی

پڑتا ہے۔" لالو کانے کو یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے کہا: "شرع میں کیا شرم۔ بازی میں کیا لحاظ۔ بازی وہ جس میں چمڑس ہو جائے۔" مسعود نے کوئی جواب دیے بغیر دو سو کے نوٹ نکال کر دری پر رکھ دیے اور چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ دیے کی لو اونچی کر دی گئی اور بازی شروع ہو گئی۔ آخری پتا دری پر پھینک کر مسعود نے رکنے کے آگے سے دو سبز نوٹ اٹھا کر اپنے نوٹوں میں رکھ لیے اور اُنھیں آگے دھکیل دیا۔

ریباں نے گردن پھیر کر کہا: "تیرے صدقے، انگوٹھی بنوا دے۔" ڈھلن نے ڈکار لے کر کہا: "تیرے صدقے، کنواں لگوا دے۔ الٹا لٹک کر مالک سے ملوں گا۔" رکنے کباڑیے نے صدری سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے اور جھلا کر لالو سے کہنے لگا، "کانے بیمبڑ پنکھا تو کر، گرمی سے جان نکل رہی ہے۔" کانا بیمبڑ پنکھا کرنے لگا تو مسعود نے ہاتھ سے اشارہ کر کے آہستہ سے کہا: "ذرا ہولے۔ دیا نہ بجھ جائے۔"

اور بازی پھر شروع ہو گئی۔

دیدی بستر پر بے معنی سی کروٹیں بدل رہی تھی اور اس کے قریب آرام کرسی میں دراز امّی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے تپائی تھی جس پر مسعود چائے پی کر گیا تھا اور اب اس تپائی پر امّی کا پرس اور کٹ کیٹ کا ایک پیکٹ پڑا تھا۔ دیدی جاگتے میں بڑبڑا رہی تھی اور امّی خاموشی سے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سن رہی تھی۔

بازی ختم ہو گئی اور مسعود نے رکنے کے چار سو سمیٹ کر اپنے نوٹوں میں ملا لیے۔ کانے نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے رکنے کو دیکھا اور بولا: "لالا!"

رکنے نے کہا: "پھر کیا ہوا؟ ابھی تو بڑی مایا ہے۔ بابو کو جی بہلانے دے۔" اور اس نے دو سو کے نوٹ نکال کر آگے رکھ لیے۔ مسعود نے کہا: "یوں نہیں۔ تخت یا تختہ۔" اور پھر سارے نوٹ آگے دھکیل دیے۔ رکنے نے کہا: "یوں تو یوں سہی۔" اور چھ اور سبز نوٹ نکال کر اگلے نوٹوں پر ڈال دیے۔ تاش کے پتے پھر انگلیوں میں ناچنے لگے۔

امّی نے چور آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا: "ابھی تک آیا نہیں، پتہ نہیں کیا وجہ ہے؟" پھر اس نے کٹ کیٹ کے پیکٹ کو انگلی سے دبا کر دیکھا جو گرمی کی وجہ سے ذرا لجلجا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر امّی نے کٹ کیٹ کے پیکٹ پر چھڑکا اور پھر کرسی پر دراز ہو گئی۔ دیدی نے قہر آلود نگاہوں سے امّی کو دیکھا اور پھر کروٹ بدل لی۔ آخری پتہ پھینکنے سے پہلے مسعود نے رکنے کے نوٹ پھر اٹھا لیے اور پتہ چوم کر اس کی گود میں پھینک دیا۔ لالو کا نادم بخود پنکھا کیے جا رہا تھا۔ چیتو، ڈھلن اور بھمبیری فرش پر سوئے ہوئے تھے اور ریباں دیوار کے ساتھ لگی اونگھ رہی تھی۔ رکنے نے لالو کی طرف دیکھا اور شرمندگی ٹالنے کے لئے دو نوٹ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے۔ مسعود نے کہا: "بس دو سو! کوئی اور جیب دیکھ، لالا۔ شاید اس میں سبزے پڑے ہوں۔"

لیکن رکنا کوئی اور جیب دیکھنے پر رضامند نہ ہوا۔ لالو کانا بولا: "کل سہی بابو۔ بولتی بند ہو جائے گی۔ لے یہ ایک دس روپے کی گرم جس یاروں کی بھی رہی۔" اور اس نے رکنے کے دو سو پر دس اور رکھ دیے۔۔۔ تاش بانٹی جانے لگی۔

امّی نے دیدی کے سرہانے تلے ہاتھ پھیر کر اس کی گھڑی نکالی اور اپنے آپ سے کہا۔

"ایک بج گیا۔"

پھاٹک ذرا سا ہلا۔ امّی تیز تیز قدم اٹھاتی ادھر گئی۔ اس نے بولٹ کھولنے سے پہلے چوڑی دراڑ میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ایک خارش زدہ کتا پھاٹک کے ساتھ اپنی کمر رگڑ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر آ کر پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔

بازی ختم ہو گئی اور مسعود نے دو سو دس روپے اٹھا کر اپنے نوٹوں میں شامل کر لیے اور رکنے سے پوچھا: "اور؟" رکنے نے معنی خیز نگاہوں سے لالو کو دیکھا اور منہ پونچھ کر بولا: "بس!" نوٹوں کی گڈی بنا کر مسعود نے سامنے کی جیب میں ڈال لی۔ جوتا

پہن کر کھڑا ہو گیا اور سوئے ہوئے بیچاروں پر نگاہ ڈال کر بولا: "اچھا، استاد، پھر سہی پہلی تاریخ کو۔"

رکنے اور لالو نے کوئی جواب نہ دیا اور مسعود خاموشی سے چل دیا۔ پھونس سے گذر کر اس نے تازہ ہوا میں ایک لمبا سانس لیا اور اندھیرے کی گود میں مڑتی ہوئی بے جان گلی کو دور تک محسوس کیا۔ پھر وہ اپنے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ تو کل اٹھارہ سو ہوئے اور گلریز نے دو ہزار مانگے ہیں۔ باقی دو سو کا بندوبست کیوں کر ہو گا اور وہ ابھی باقی دو سو کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے گلے میں صافہ ڈال کر اسے زمین پر گرایا۔ گرتے ہی ایک تیز دھار چاقو کا لمبا پھل اس کے سینے سے گزر کر دل میں اتر گیا۔

ایک آواز نے کہا: "کانے بیمبڑ یہ کیا کیا۔۔۔ نوٹ نکال نوٹ۔" کانے بیمبڑ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالنے کی کوشش کی مگر چاقو کا پھل نوٹوں کو پروتا ہوا پسلیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس نے زور لگاتے ہوئے کہا: "لالا نکلتے نہیں۔" اور جب لالا نوٹ نکالنے کو جھکا تو گلی کے دہانے پر سپاہی سیٹیاں بجانے لگے اور وہ دونوں مسعود کو یونہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسعود نے زور لگا کر چاقو باہر نکالا اور اسے پرے پھینکا۔ پھر اس نے خون آلود نوٹوں کی گڈی جیب سے نکالی اور اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکا۔ پیٹ کے بل لیٹ کر اس نے نوٹ دائیں ہاتھ میں پکڑ لیے اور اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ کہنی کو زمین پر دبا کر اس نے آگے گھسٹنا چاہا لیکن جونہی کہنی اس کے پہلو سے آ کر لگی اس کا ہاتھ زمین سے جا ٹکرایا اور اس کی جیب سے ایک کروشیا نکل کر باہر گر پڑا۔ مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا:

"امّی۔۔۔ می۔۔۔ میں۔۔۔ امّی۔۔۔" لہو کی آخری بوند زمین پر گری اور اس کی مٹھی ڈھیلی ہو گئی۔

امّی نے ٹھنڈے پانی میں انگلی ڈبو کر ایک قطرہ کٹ کیٹ پر ٹپکاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا، ”ابھی تک آیا نہیں!“

﴿احمد ندیم قاسمی، سہ ماہی لوح، مدیر: ممتاز احمد شیخ، اردو بازار کراچی، شمارہ ۵
۔۶، جون تا دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۳۴۸۔۳۵۸﴾

منشی پریم چند

دودھ کی قیمت

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں بھی نظر آتی ہیں لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچّہ خانہ روش قدیم کی طرح بھنگنوں کے ہی دائرہ اقتدار میں ہے اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے تعلیم یافتہ بھی تھے۔ زچّہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی۔

لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ہمت ہی کیونکر ہو سکتی ان کا حقِ الخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نصف ملکیت بیچ ہونے پر بھی پورا ہوتا۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گوڈر کی بہو۔ بچّے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گوڈر گوڈر کی ہانک لگائی۔ چماروں کی ٹولی جاگ اٹھی۔

گوڈر کے گھر میں اس روزِ سعید کی مہینوں سے تیاری تھی خدشہ تھا تو یہی کہ کہیں بیٹی نہ ہو جائے۔ نہیں تو پھر وہ ہی بندھا ہوا روپیہ اور وہی ایک ساڑھی مل کر رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بار بار تبادلہ خیالات ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں۔ گوڈر کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہوا تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں۔ منہ نہ دکھاؤں اور گوڈر کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہو گی اور بیچ کھیت بیٹی ہو گی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوالوں گا۔ شاید گوڈر سمجھتا تھا کہ اس طرح بھنگن میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لئے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگن بولی: "اب منڈوالے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بیٹا ہوگا پر سنتے ہی نہیں اپنی رٹ لگائے۔ کھد تیری مونچھیں مونڈوں گی۔ کھونٹی تو رکھوں نہیں۔"

گوڈر نے کہا: "اچھا مونڈ لینا بھلی مانس۔ مونچھیں کیا پھر نکلیں گی ہی نہیں۔ تیسرے دن پھر دیکھو گی جوں کی توں ہیں۔ مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا۔ رکھ لوں گا۔ کہے دیتا ہوں۔"

بھنگن نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچّے کو گوڈر کے سپرد کر، سپاہی کے ساتھ چل دی۔ گوڈر نے پکارا: "اری سن تو کہاں بھاگی جاتی ہے مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا۔"

بھنگن نے دور سے ہی کہا: "تو کون بڑی مشکل ہے وہیں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا۔ میں آکر دودھ پلا دیا کروں گی۔"

مہیش ناتھ کے یہاں اب کے بھنگن کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا۔ دوپہر کو پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر۔ اور گوڈر کو بھی بھرپور پروسا ملتا تھا۔ بھنگن اپنے بچّے کو دن بھر میں دوبار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی۔ اس کے لئے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگن کا دودھ بابو صاحب کا بچّہ پیتا تھا اور یہ سلسلہ بارھویں دن بھی بند نہ ہوا۔ مالکن موٹی تازی عورت تھی مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق کہ دودھ ہی نہیں۔ تینوں لڑکیوں کی بار اتنے افراط سے دودھ ہوتا تھا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بوند نہیں بھنگن جنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا: "بھنگن ہمارے بچّے کو پال دے پھر جب تک جیے بیٹھی کھاتی رہنا۔ پانچ بیگھے معافی دلوادوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے۔" اور بھنگن کا لاڈلا اوپر کا دودھ ہضم نہ کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگن کہتی: "اور مونڈن میں جوڑے لوں گی بہوجی کہے دیتی ہوں۔"

بہو جی: "ہاں ہاں جوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے۔ چاندی کے لے گی یا سونے کے۔"

"واہ بہو جی واہ۔ چاندی کے جوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی۔"

"اچھا سونے کے لینا بھئی کہتی تو ہوں۔"

"اور بیاہ میں کنٹھالوں گی اور چودھری (گوڈر) کے لئے ہاتھوں کے توڑے۔"

بہو جی: "وہ بھی لینا۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں۔"

گھر میں مالکن کے بعد بھنگن کی حکومت تھی۔ مہریاں، مہراجن، مزدورنیں سب اس کا رعب مانتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود بہو جی اس سے دب جاتی تھی۔ ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا۔ ہنس کر ٹال گئے۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی۔ مہیش ناتھ نے کہا تھا: "دنیا میں اور چاہے کچھ ہو جائے بھنگی بھنگی رہیں گے انھیں آدمی بنانا مشکل ہے۔" اس پر بھنگن نے کہا تھا: "مالک بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں۔ انھیں کیا کوئی آدمی بنائے گا۔"

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقع پر بھلا بھنگن سلامت رہتی۔ سر کے بال اکھاڑ لیے جاتے لیکن آج بابو صاحب ہنسے اور قہقہہ مار کر بولے: "بھنگن بات بڑے پتے کی کہتی ہے۔"

بھنگن کی حکومت سال بھر تک قائم رہی۔ پھر چھن گئی۔ بچّے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا۔ موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے۔ پھٹکار پلائی: "پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی۔ کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا۔ اب پرائشچت کرنا چاہیے واہ۔"

شاستری جی بولے: "بے شک کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا۔ گوشت کھا کر پلا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ لیکن کل کی بات کل تھی آج کی بات آج ہے۔ جگن ناتھ

پور میں چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے۔ کھچڑی تک کھا لیتے ہیں۔ بابو جی اور کیا کہیں۔ پوری تک نہیں رہ جاتے۔ لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ۔"

"اور کیا! راجہ کا دھرم الگ، پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ، غریب کا دھرم الگ۔ راجہ مہاراجے جو چاہیں کھائیں۔ جس کے ساتھ چاہیں کھائیں جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں۔ ان کے لئے کوئی قید نہیں۔ راجہ ہیں مگر ہمارے اور تمہارے لیے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ اس کا دھرم ہے۔" پرائشچت تو نہ ہوا۔ لیکن بھنگن سے اس کی سلطنت چھین لی گئی۔ برتن، کپڑے اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لے جا سکی اور سونے کے جوڑے بھی ملے۔ اور ایک دو نئی خوبصورت ساڑھیاں۔ معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بار ملی تھیں۔

اسی سال چیچک کا زور ہوا۔ گوڈر پہلے ہی زد میں آ گیا۔ بھنگن اکیلی ہی رہ گئی۔ مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگن کے لئے گوڈر اتنا ضروری نہ تھا جتنا گوڈر کے لئے بھنگن۔ لوگ منتظر تھے کہ بھنگن اب گئی اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے لیکن بھنگن کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گذر گئے اور منگل دبلا کمزور اور دائم المرض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا۔ دائم المرض کیوں نہ ہوتا۔

ایک دن بھنگن مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی۔ مہینوں سے غلاظت جمع ہو گئی تھی۔ آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی۔ پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکایک اس نے چلّا کر ہاتھ باہر نکال لیا اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا۔ لیکن بھنگن کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے۔ زیادہ

زہریلا نہ ہو گا۔ اس لیے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں۔ تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا۔ دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈلایا کرتا گھر میں اتنا جوٹھا بچتا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچّے سیر ہو سکتے تھے۔ منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی ہاں دور ہی سے اسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دور دور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں کھاتے ہیں اس کے لئے مٹی کے سکورے۔ یوں اسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلّت کے احساس کو سان پر چڑھاتے رہتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو سکورے اور دھوتی جو مہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اتارے کپڑوں میں سے ایک تھی۔ جاڑا، گرمی، برسات، ہر موسم کے لئے وہ ایک سی آرام دہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی اور سخت جان منگل جھلستی ہوئی لو اور کڑاکے کے جاڑے اور موسلا دھار بارش میں زندہ تھا اور تندرست تھا۔ بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتّا جو اپنے ہم چشموں کی بدمزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے تنگ آکر منگل کے زیر سایہ آپڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غالباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی۔ مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگریزی کتّے کا نام تھا۔ اس لیے اس کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا: "دیکھو ٹامی، ذرا اور کھسک کر سوؤ۔ آخر میں کہاں لیٹوں۔ سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا۔" ٹامی کوں کوں کرتا اور دم ہلاتا۔ بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھ آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی دیواریں کھڑی تھیں۔ جس کا اوپر کا حصہ نوک دار ہو گیا تھا۔ یہیں اسے

محبت کی دولت ملی تھی وہی مزا وہی یاد وہی کشش اسے ایک بار ہر روز اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گذشتہ خواب دیکھنے لگتا اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہو گیا۔ سریش کو اس پر رحم آیا یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی۔ کچھ ہی ہو اس نے تجویز کی کہ آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے۔ یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا: "کیوں رے کھیلے گا؟"

منگل بولا: "کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا؟"

سریش نے کہا: "اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں اور تم ٹٹو بن جاؤ۔ ہم لوگ تمھارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے۔"

منگل نے پوچھا: "میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا۔"

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ غور کر کے کہا: "تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں۔"

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا: "میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ سوار بنو اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا۔"

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا: "تجھے گھوڑا بننا پڑے گا۔" اس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا سریش بھی دوڑا، منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا مگر بسیار خوری نے اسے تھل تھل بنا دیا تھا۔ اور دوڑنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رک کر کہا: "آ کر گھوڑا بنو ورنہ کبھی پاؤں گا تو بُری طرح پیٹوں گا۔"

"تمھیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا۔"

"اچھا ہم بھی بن جائیں گے۔"

"تم بعد میں بھاگ جاؤ گے اس لیے پہلے تم بن جاؤ۔ میں سواری کر لوں پھر میں بنوں گا۔"

سریش نے چکمہ دیا۔ منگل نے اس کے مطلب کو برہم کر دیا۔ ساتھیوں سے بولا: "دیکھو اس کی بد معاشی، بھنگی ہے۔"

تینوں نے اب کے منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور ٹک ٹک کر کے بولا: "چل گھوڑے چل" مگر اس کے بوجھ کے نیچے غریب منگل کے لئے ہلنا بھی مشکل تھا دوڑنا تو دور کی بات تھی۔ ایک لمحہ تو وہ ضبط کیے چوپایہ بنا کھڑا رہا لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریڑھ کی ہڈّی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا سریش گدسے گر پڑا۔ اور بھونپو بجانے لگے۔ ماں نے سنا سریش کیوں رو رہا ہے۔ گاؤں میں کہیں سریش روئے ان کے ذکی الحسن کانوں میں ضرور آواز آجاتی تھی اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سریش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چپ کرانے کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے مگر بہت بیوقوف حد سے زیادہ پیارے۔ ماں نے پوچھا: "کیوں رو رہا ہے سیریش؟ کس نے مارا؟" سریش نے روتے ہوئے کہا: "منگل نے چھو دیا۔"

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہو گیا۔ اس نے منگل کو بلوایا اور ڈانٹ کر بولی: "کیوں رے منگلو اب تجھے بد معاشی

سوجھنے لگی میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سریش کو چھونا نہیں۔ یاد ہے کہ نہیں، بول۔"
منگل نے دبی آواز سے کہا: "یاد ہے"

"تو پھر تو نے اسے کیوں چھوا؟ تو نے نہیں چُھوا تو یہ روتا کیوں تھا؟"

"یہ گر پڑے اس لیے رونے لگے۔"

"چوری اور سینہ زوری" دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ ماریں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ قینچی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی برقی رو قینچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی اس لیے جہاں تک گالیاں دے سکیں، دیں اور حکم دیا کہ "اسی وقت یہاں سے نکل جا۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔"

منگل میں غیرت تو کیا ہو گی خوف تھا۔ چپکے سے اپنے سکورے اٹھائے، ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا، دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ یہی تو ہو گا کہ بھوکوں مر جاؤں گا کیا ہرج ہے اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا۔ گاؤں میں اور کہاں جاتا۔ بھنگی کو کون پناہ دیتا۔ وہی اپنے بے درودیوار کی آڑ تھی۔ جہاں پچھلے دنوں کی یادیں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں۔ وہیں جا کر پڑ رہا۔ اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا ہو گا کہ ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا۔

لیکن جوں جوں شام ہوتی گئی اس کا احساسِ ذلّت بھی غائب ہوتا گیا۔ بچپن کی بے تاب کرنے والی بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس نے مشورتاً ٹامی سے کہا: "کھاؤ گے کیا؟ میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔" ٹامی نے کوں کوں کر کے شاید کہا: "اس طرح کی ذلّتیں تو ساری زندگی سہنی ہیں پھر ذرا دیر میں دم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ ہماری زندگی اسی لیے ہے بھائی۔"

منگل بولا: "تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھالو۔ میری پرواہ نہ کرو۔" ٹامی نے پھر اپنی سگستانی بولی میں کہا: "اکیلا نہیں جاتا تمھیں ساتھ لے چلوں گا۔" ایک لمحہ بعد پھر بھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ "مالکن تلاش کر رہی ہوں گی۔ کیوں ٹامی۔" اور کیا بابو جی اور سریش کھا چکے ہوں گے؟ کہار نے اُن کی تھالی کا جوٹھا نکال لیا ہو گا اور ہمیں پکار رہا ہو گا۔ بابو جی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور میٹھی میٹھی چیز۔ ہاں ملائی۔ ہماری آواز نہ سنائی دے گی۔ تو سب کا سب گھورے پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں پوچھنے آتا ہے۔ یہاں کون پوچھنے آئے گا۔ کوئی برہمن ہوں۔"

"اچھا چلو تو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آوں گا۔ یہ سمجھ لو۔"

دونوں وہاں سے نکلے اور آکر مہیش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ٹامی شاید اِدھر ادھر خبر لانے چلا گیا۔ مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے نوکر آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: "آج منگلو نہیں دکھائی دیتا۔ بھوکا ہو گا بے چارہ۔ مالکن نے ڈانٹا تھا۔ اسی لیے بھاگا تھا شاید۔" منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا: "اچھا ہوا نکالا گیا۔ نہیں تو سبیرے سبیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔" منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا۔ اب کیا امید کی جا سکتی تھی۔ مہیش اور سریش تھالی سے اٹھ گئے نوکر ہاتھ منہ دھلا رہا ہے۔ اب بابو جی حقّہ پئیں گے۔ سریش سوئے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہو گئی کسی نے نہیں پکارا۔ کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹے تک وہاں دبکا رہا۔ کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جوٹھا کھانا لے جاتے دیکھا۔ شاید گھورے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔ اب صبر نہ ہو سکتا تھا۔ کہار نے کہا ارے تو یہاں تھا۔ ہم نے کہا: "کہیں چلا گیا۔ لے کھالے میں پھینکنے لے جا رہا تھا۔" منگل نے کہا: "میں تو بڑی دیر سے یہاں کھڑا تھا۔ کہار نے کہا تو بولا کیوں نہیں۔" منگل بولا: "ڈر لگتا تھا۔" منگل نے کہا، ر کے ہاتھ سے تھال لے لیا اور اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسان مندی کی

ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا: "دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے؟ ٹامی نے دم ہلائی۔ سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی۔"

ٹامی نے پھر دم ہلا دی۔ لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا۔ ٹامی نے دم ہلا دی۔ "اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے۔" ٹامی نے پھر دم ہلا دی۔

﴿منشی پریم چند، پریم چند کے منتخب افسانے، انتخاب: شمیم حنفی، انجمن ترقی اردو {ہند}، نئی دہلی، سن اشاعت ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۳۔ ۱۳۰﴾

کرشن چندر

ممتا

یہ کوئی دو بجے کا وقت تھا، بادلوں کا ایک ہلکا سا غلاف چاند کو چھپائے ہوئے تھے۔ یکا یک میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ والی چارپائی پر اماں سسکیاں لے رہی ہیں

"کیوں امی؟" میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

"کیوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امی!" اماں نے سسکیاں اور ہچکیوں کے درمیاں میرے سوال کو غصہ سے دہراتے ہوئے کہا۔ "شرم نہیں آتی، باپ کو بھی اور بیٹے کو بھی اتنے بڑے ہو گئے ہو، کچھ خدا کا خوف نہیں۔"

"آخر ہوا کیا؟" میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا۔ "یہ آدھی رات کے وقت رونا کیسا؟"

گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سب برآمدے میں سو رہے تھے۔ مگر ابا اندر سامنے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ اُن کی طبیعت ناساز تھی اور اُنھیں اکثر گرمیوں میں بھی سردی لگ جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اس لیے عموماً وہ اندر ہی سویا کرتے تھے۔ آخر اُن کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہیں بستر پر سے کروٹ بدل کر بولے۔ "کیا بات ہے وحید؟ تمہاری اماں کیوں رو رہی ہے؟"

"میں کیا بتاؤں ابا۔ بس رو رہی ہیں۔"

"ہاں اور تمھیں کس بات کی فکر ہے۔" اماں کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔ "پتہ نہیں میرا لال اس وقت کس حالت میں ہے۔ میرا چھوٹا محمود اور تم یہاں پڑے سو رہے ہو۔ وہاں اس کا کون ہے، نہ ماں، نہ بھائی، نہ بہن اور تم خراٹے لے رہے ہو۔ آرام سے

جیسے تمھیں کسی بات کی فکر ہی نہیں۔(سسکتے ہوئے)"میں نے ابھی ابھی اپنے چھوٹے محمود کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ ایک میلے کچیلے بستر میں پڑا بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کا پنڈا تنور کی طرح گرم تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اماں، اماں کہہ رہا تھا۔۔۔" یہ کہہ کر اماں زور زور سے رونے لگیں۔

اماں کا "چھوٹا محمود" اور میرا بڑا بھائی لاہور بی۔اے میں تعلیم پاتا تھا، تھرڈ ائیر میں، میں ایف اے کا امتحان دے کر لاہور سے یہاں مئی کے مہینے ہی میں آ گیا تھا، مگر محمود کو ابھی لاہور کی تپتی ہوئی فضاؤں میں پورا ایک مہینہ اور گزارنا تھا۔ لیکن اب جون کا مہینہ بھی گزر گیا تھا اور محمود ابھی تک لاہور سے واپس نہ آیا تھا۔ اماں بہت پریشان تھیں اور سچ پوچھیے تو ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہم نے اسے پرسوں ایک تار بھی دے دیا تھا اور مدتوں کے بعد اچانک محمود کا ایک خط بھی آیا تھا۔ چند مختصر سطور تھیں۔ لکھا تھا۔ "میں بیمار ہوں، ملیریے کا بخار ہے۔ لیکن اب ٹوٹ رہا ہے۔ چند دنوں سے یہاں بہت بارش ہو رہی ہے۔ اگر لاہور کا یہ حال ہے تو اسلام آباد میں کیا ہو گا۔ کیا کشمیر آنے کا راستہ کھل گیا؟ جلدی لکھیے کہ کس راستے سے آؤں، کیا جموں بانہال روڈ سے آؤں۔۔۔۔۔۔ کہ کوہالہ اوڑی سڑک سے، کونسا راستہ بہتر رہے گا؟" ہم نے سوچ بچار کے بعد ایک تار اور دے دیا تھا۔ بارش بہت ہو رہی تھی اور دونوں سڑکیں شکستہ حالت میں تھیں۔ پھر بھی کوہالہ اوڑی روڈ، بانہال روڈ سے بہتر حالت میں تھی۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ محمود کوہالہ روڈ ہی سے آئے۔ اب آدھی رات کے وقت یہ افتاد آن پڑی۔

ابا کی نیند پریشان ہو گئی تھی۔۔ بے چین ہوتے ہوئے بولے۔ "تو اس کا کیا کیا جائے؟ اور تمھیں تو یونہی دل میں وسوسے اٹھا کرتے ہیں۔ بھلا اس کا علاج کیا؟ آخر محمود کوئی بچہ تو نہیں؟ تمھیں فکر کس بات کی ہے۔ ہزاروں ماؤں کے لال لاہور میں پڑھتے ہیں اور ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ آتا ہی ہو گا، اگر آج صبح وہ لاہور سے چلا تو شام کو وہ راولپنڈی پہنچ گیا ہو گا کل کوہالہ اور۔۔۔۔"

اماں جلدی سے بولیں۔ "اور ۔۔۔۔ اور؟ کیا غضب کرتے ہو اور اگر خدانہ کرے۔ اس کا بخار ابھی نہ ٹوٹا ہو تو پھر؟ میں پوچھتی ہوں تو پھر؟" یہ کہہ کر اماں رک گئیں اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔

"مجھے موٹر منگوادو۔ میں ابھی لاہور جاؤں گی۔"

"اب تم سے کون بحث کرے ہمیں تو نیند آئی ہے۔" یہ کہہ کر ابا کروٹ بدل کر سو رہے۔ میں نے بھی یہی مناسب جان کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر کانوں میں ماں کی مدھم سسکیوں کی آواز جسے وہ دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں، برابر آرہی تھی۔ کیا دل ہے ماں کا اور کتنی عجیب ہستی ہے اس کی؟ میں آنکھیں بند کیے سوچنے لگا۔ ماں کا دل، ماں کی محبت، مامتا، کس قدر عجیب جذبہ ہے، عالمِ جذبات میں اس کی نظیر ملنی محال ہے۔ نہیں یہ تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک سپنے کے دھندلکے میں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھتی ہے اور چونک پڑتی ہے۔ لرز جاتی ہے۔ مامتا۔۔۔۔ کیا اس جذبے کا اساس محض جسمانی ہے، محض اس لیے کہ بیٹا ماں کے گوشت و پوست کا ایک ٹکڑا ہے؟ اور کیا ہم سچ مچ فلابیر کے تخیل کے مطابق اس کائنات میں اکیلے ہیں، تنہا، بے یارومددگار، ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے بھی ناآشنا، مگر میں بھی تو محمود کا بھائی ہوں، میری رگوں میں وہی خون موجزن ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کے ان بیس سالوں میں صرف دو دفعہ محمود سے جدا ہوا ہوں اور وہ بھی نہایت قلیل عرصے کے لئے۔ پھر میں کیوں اس قدر اس کے لئے بیتاب و بیقرار نہیں۔؟۔۔۔ کیا ہم سچ مچ پتھروں کے تودوں کی طرح ہیں مصر کے میناروں کی طرح خوبصورت لیکن بے جان اشوک کے کتبوں کی طرح سبق آموز لیکن بے حس، بے روح؟۔۔۔ بدھ نے کہا تھا کہ یہ دنیا دھوکا ہے، سراب ہے، مایا ہے، ہوگی۔ لیکن یقین نہیں پڑتا آخر یہ حسین جذبہ کہاں سے آیا؟ اور کائنات کے ایک گوشے میں سسکتی ہوئی اماں کیا یہ بھی ایک دھوکا ہے؟ سچ جانیے یقین نہیں پڑتا ہے۔

چھوٹا محمود۔۔۔ میرا ننھا محمود۔۔۔ میرا لال

امی ہلکی ہچکیوں میں بھائی کا نام لے رہی تھیں۔ کتنی معمولی سی بات تھی۔ بھائی جان شاید ابھی لاہور ہی میں ہوں گے۔ ضیافتیں اڑاتے ہوں گے، سینما دیکھتے ہوں گے۔ یا اگر لاہور سے چلے آئے ہوں تو راولپنڈی میں اس وقت خوابِ خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔ ملیریا کیا عجب ملیریا کا بخار مطلق ہی نہ ہو۔ میں بھائی جان کے بہانوں کو خوب جانتا ہوں، اماں بھی جانتی ہیں مگر پھر بھی رو رہی ہیں۔ آخر کیوں؟ شاہد یہ کوئی روحانی قرابت ہے، شاید اس دنیا کے وسیع صحرا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ شاید ہم محض پتھروں کے تودوں کی طرح نہیں ہیں۔ شاید اس انسانی مٹی میں کسی ازلی آگ کے شعلوں کی تڑپ ہے۔ مجھے موپاساں کا افسانہ "تن تنہا" یاد آگیا۔ جس میں اس نے اس شدید احساس تنہائی کا رونا رویا ہے۔ آہ بے چارہ موپاساں، وہ ایک ماہر نفسیات تھا اور ایک ماہر نفسیات کی طرح وہ کئی بار نفسیاتی واردات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہا۔ اس کے افکار نے اسے کثرت غلط راستہ پر ڈال دیا۔ "تن تنہا" ایک ایسی ہی مثال ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"عورت ایک سراب ہے اور ہم ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے، میاں بیوی سالہا سال ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔۔۔۔۔ دو دوست ملتے ہیں اور ہر دوسری ملاقات میں ایک دوسرے دور چلے جارہے ہیں۔۔۔۔ نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے۔۔۔۔۔ اور جب میں عورت کو دیکھتا ہوں تو مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اماں کی طرف دیکھا، امی روتے روتے سوگئی تھیں، گال آنسوؤں سے گیلے تھے اور بند آنکھوں کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ کیا امی موت ہے؟ اور کیا مامتا بھی کوئی ایسا ہی ہلاکت آفریں جذبہ ہے؟ شاید موپاساں غلطی پر تھا، شاید اسے یہ لکھتے وقت اپنی شفیق ماں کی یاد نہ آئی تھی۔ وہ اس کی جان بخش لوریاں، وہ نرم نرم تھپکیاں جبکہ وہ بچوں کی طرح صرف "اوں اوں" کہہ کر بلبلا اٹھتا تھا اور اس کی چھاتی سے لپٹ جاتا تھا۔۔۔۔ نسوانی محبت مستقل دھوکا۔۔۔۔۔۔ شاید اسے اپنی اماں کے وہ طویل بوسے بھول گئے کہ جب بڑا ہونے پر بھی اس کا نفسیاتی سر اپنے

بازوؤں میں لے لیتی تھی اور پیار کرتی تھی۔ جب وہ مامتا سے بیقرار ہو جاتی تھی اور اُن کی غیر حاضری میں بھی اس کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ اس کی ہر غلطی کو بچوں کی بھول سے تعبیر کیا کرتی تھی اور گناہ کو نیکی میں مبدل کر دیتی تھی۔ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں وہ اس شدید احساس تنہائی جس کی موپاساں کو شکایت ہے، جو دنیاوی کلفتوں اور الفتوں میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا، نجانے وہ ماں کی گود میں آکر کیسے ناپید ہو جاتا ہے؟ ماں کے جذبہ محبت میں ایک ایسی دیوانگی و وارفتگی ہے جو اس کی انانیت کو فنا کر دیتی ہے اور اس کی ذات کو بچوں میں منتقل کر دیتی ہے۔ یقیناً ہم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں۔۔۔ یقیناً۔۔۔ مگر۔۔۔۔

غٹر غوں، غٹر غوں، ککڑوں کوں، کبوتر، مرغ، چڑیاں، دوشیزہ سحر کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اُن کی خوش الحانی نے مجھے بیدار کر دیا، میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکا دیں اور آنکھیں ملنے لگا۔ اتنے میں آنگن سے اماں کی آواز آئی۔

"بیٹا وحید اٹھو، محمود آ گئے۔"

آنکھیں کھول کر دیکھا تو سچ مچ۔۔۔۔ اماں آنگن میں اُگے ہوئے چنار کے بوٹے کے نیچے ایک مونڈے پر بیٹھی تھیں اور محمود اُن کے پیروں پر جھکا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا آنگن میں ہم دونوں بھائی بغل گیر ہوئے۔

"اتنے دن کہاں رہے" میں نے محمود سے پوچھا۔

محمود نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ لی۔ پھر گردن موڑ کر پنچ تارے کے سرخ سرخ پھولوں کے گچھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

”کوئی سات روز جھڑی رہی، متواتر بارش ہونے سے سڑک جابجا سے بہہ گئی تھی اور سپرنٹنڈنٹ ٹریفک نے راستہ بند کر دیا تھا۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور یہ کہہ کر ایک ہاتھ میرے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے ہلانے لگا۔

اماں کدو چھیل رہی تھیں اور ہم دونوں کو دیکھتی جاتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں پرنم تھیں۔ آنسوؤں کے اُن دو سمندروں میں خوشیوں کی جل پریاں ناچ رہی تھیں۔

https://www.jasarat.com/sunday/2018/05/06/269436/

خواجہ احمد عباس

﴿تین مائیں ایک بچہ﴾

بچہ ایک تھا ۔۔۔ چار پانچ برس کا ہوگا۔ خوبصورت تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ مگر اُن آنکھوں میں دنیا بھر کا غم بھرا ہوا تھا۔ جیسے ایک بڑے گمبھیر فلاسفر کو پاکٹ سائز کا بنادیا گیا ہو۔ جسم بھی لاغر تھا۔ جو تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ بچپن ہی سے ایک بھکارن کے یہاں پلا تھا جو اسے نہ دودھ ہی دے سکتی تھی نہ انڈا۔ نہ کوئی وٹامن، نہ پروٹین۔ نہ مچھلی، نہ چکن۔

بچہ کا مقدمہ سارے ملک میں مشہور تھا۔ ٹیلی ویژن پر جن بھکاری اور لاوارث بچوں کی تصویریں آتی تھیں، اُن میں یہ بچہ بھی تھا۔ سارے ملک میں ایک ہمدردی اور شفقت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جب بچے نے اپنی توتلی زبان سے کہا تھا: "میری ماں بھگوان کے پاس چلی گئی ہے۔"

اُن ٹیلی ویژن دیکھنے والوں میں دو خوشحال، بڑے خاندانوں کی عورتیں بھی تھیں۔ بچے کو دیکھتے ہی اُن کی ما متا ابل پڑی۔ ایک بمبئی میں تھی۔ ایک دہلی میں۔ لیکن دونوں نے فوراً کہا: "یہ تو میرا بچہ ہے۔" اگرچہ ایک نے کہا: "یہ تو میرا بچہ گوپال ہے۔" اور دوسری نے کہا: "یہ تو میرا بچہ حامد ہے۔"

جو بمبئی میں تھیں، وہ مسز لکشمی جے سوریہ تھیں۔ جو اصل میں وژیاگ پٹنم کی رہنے والی تھیں، مگر اب چند سال سے بمبئی میں مقیم تھیں کیونکہ اُن کے شوہر مسٹر جے سوریہ ایک پانی کے جہاز بنانے والی کمپنی میں انجینئر تھے۔ پہلے وہ دوہزار ماہوار پر گورنمنٹ کے ملازم تھے اور وژیاگ پٹنم کے شپ یارڈ میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے ایک پرائیویٹ فرم کو لاکھوں کا فائدہ پہنچانے کے الزام میں suspend کے گئے اور اسی پرائیویٹ فرم نے اُن

کو بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ایک بڑی امپورٹیڈ کار اور سمندر کے کنارے سجا سجایا فلیٹ مفت۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے تھے۔ گھر میں ہر قسم کا اعلی سامان تھا۔ جاپانی گڑیاں اپنے شیشے کے گھروں میں سے اپنی مردہ نیلی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پلاسٹک کے پھول گلدانوں میں سجے تھے جن میں سے نہ بو آتی تھی نہ باس۔ نہ ہی پانی دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن دیکھنے میں بالکل اصل لگتے تھے۔ لیکن جب کبھی گھر میں پارٹی ہوتی تھی تو مسز لکشمی جے سوریہ ان کے پتوں پر پانی چھڑک دیتی تھیں اور پھولوں پر سینٹ کی پچکاری سے سینٹ چھڑک دیتی تھیں۔ گھر میں بس ایک ہی چیز کی کمی تھی۔ وہ ایک بچہ تھا۔

سو لکشمی جے سوریہ نے جیسے ہی بڑی بڑی افسردہ آنکھوں والے بھکاری بچے کو دیکھا اور اُن کو یقین ہوگیا کہ یہ اُن کا ہی کھویا ہوا گوپال ہے، وہ بچے پر اپنا حق ثابت کرنے کے لئے اپنے شوہر کے تمام رسوخ استعمال کرنے کے لئے تیار ہوگئیں۔

ادھر دہلی میں اُن کی ہی عمر کی بیگم شہناز مغل مرزا نے جب بچے کو دیکھا، جن کے شوہر کی ساری جائیداد دلی اور نئی دہلی میں بکھری پڑی ہوئی تھی کیونکہ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ شاہی خاندان سے ہیں۔ اصل میں وہ شاہی خاندان سے تو نہیں تھے لیکن اُن کے پکڑ دادا وکڑ داد بادشاہ سلامت کے حقہ بردار ضرور تھے جو اپنے حقے کی آواز کی مناسبت سے گڑگڑ بیگ کہلاتے تھے اور اس لیے محل کے ماحول سے اور محل کی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ غدر کے بعد جب بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کیا گیا تو اُن کے حقہ بردار نے کھلم کھلا انگریزوں کا ساتھ دیا اور بادشاہ کے بہت سے راز اور بہت سے خزانے انگریزوں کے سامنے ظاہر کردیے۔ جس کے انعام میں انگریزوں نے بہت سی شاہی جائیداد اُن کے نام کردی اور اعلان کردیا کہ شہزادہ"گڑ گڑ بیگ" سے حقے کی بو آتی تھی اس لیے انھیں "گل

گل بیگ" بنادیا گیا تھا۔"گل گل بیگ" اُن اصل شہزادوں میں سے ایک ہیں جو آخر وقت تک برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہے۔ غرض اب کہ صاحب جایئداد ہوگئے تھے، اُنھوں نے اور اُن کے بیٹوں پوتوں نے اس جائیداد کو سوا سو برس میں کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ ہر ایک حویلی گلی قاسم جان میں، ایک حویلی بلیماران میں۔ ایک باغ سبزی منڈی میں، جو اب مغل باغ کہلاتا تھا۔

نئی دہلی بننے کا اعلان ہوتے ہی انگریز افسروں کے اشارے پر اُنھوں نے زمین کے بہت سے ٹکڑے خرید لیے۔ اب وہاں اونچی اونچی بلڈ نگیں بن گئیں تھیں۔ "مرزا ٹیرس"، "مغل پیلیس ہوٹل" اور "حویلی اپارٹمنٹس"، چند عمارتیں تھیں جو یا تو مرزا مغل بیگ کی اپنی تھیں یا جن میں اُن کا بڑا حصہ تھا۔

اُن کا اپنا گھر "گل گل محل"جو اُنھوں نے اپنے جدامجد کے نام پر رکھا تھاایک فرانسیسی آر کی ٹیکٹ نے مغل اسٹائل میں تعمیر کیا تھا۔ اس لیے اس میں مغل نفاست اور نزاکت کے ساتھ یوروپین functionalism کا امتزاج تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھنے میں مغل پیلس لگتا تھا لیکن اندر اسٹین لیس اسٹیل اور شیشے سے کام لے کر بیڈروم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، باتھ روم وغیرہ بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں بھی بس ایک ہی کمی تھی۔ مرزا مغل بیگ کا کوئی جانشین نہیں تھا۔ ایک بچہ تھا جو گورنیس کی غفلت سے یا اس کے مجرمانہ تغافل سے چھ مہینے کی عمر میں ہی کھو گیا تھا۔ مغل بیگ نے تقریباً ایک لاکھ روپے تو بچے کو ڈھونڈنے میں ہی لگادیے تھے لیکن وہ نہ ملا تھا۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب ایک دن وہ جم خانہ کلب میں رمی کھیل رہے تھے اور بیگم صاحبہ گھر میں ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں، اُن کے گھر سے ٹیلی فون آیا۔

"کون شہناز ! بھئی کتنی بار کہا ہے کہ جب ہم گیم کھیل رہے ہوں تو ٹیلی فون نہ کیا کرو۔ یہاں ہزاروں کی بازی لگی ہوئی ہے۔"

مگر شہناز بیگم کا جواب پاکر وہ اچمبھے میں رہ گئے۔ "بھاڑ میں جائے تمہاری ہزاروں کی بازی۔ ہمارا شہزادہ مل گیا ہے۔"

"ہمارا شہزادہ مل گیا ہے؟ کہاں ملا؟"

"بمبئی میں ہے۔ وہاں ہمیں جانا پڑے گا اسے لانے کے لئے۔ پولیس کمشنر کے نام ایک لیٹر آف انٹروڈکشن لے لینا۔"

اگلے دن سویرے ہی وہ ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک اور ماں نے دعوا کیا ہے کہ بچہ اس کا ہے۔ وہ لوگ بھی بڑے ذی اثر معلوم ہوتے ہیں۔ کسی شپنگ کمپنی میں انجینئر ہیں۔

معاملہ کورٹ میں پہنچا۔

مسز لکشمی جے سوریہ کو بلایا گیا۔

"آپ کا نام؟" سرکاری وکیل نے پوچھا۔

"مسز لکشمی جے سوریہ۔"

"آپ کا دھرم؟"

"ہندو۔ برہمن۔"

"معاف کیجے گا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی کیا مطلب !میرے شوہر مسٹر جے سوریہ ہیں۔ شپنگ انجینئر۔"

"صرف جو بات پوچھی جائے، اس کا جواب دیجیے۔ کتنے سال ہوئے ہیں آپ کی شادی کو؟"

"جی چار برس۔ نہیں نہیں۔۔۔ .پانچ برس۔"

"ٹھیک ٹھیک بتایئے۔"

"ٹھیک یاد نہیں۔ کوئی چار پانچ برس ہوئے ہوں گے۔"

"اپنی شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں؟"

"جی تاریخ تو یاد ہے۔ اونم کے دن ہماری شادی ہوئی تھی، میناکشی مندر میں۔"

"میں صرف تاریخ اور سنہ پوچھ رہا ہوں۔ کہاں ہوئی تھی، یہ میں نے ابھی نہیں پوچھا ہے۔۔۔ کس سنہ میں آپ کی شادی ہوئی تھی، وہ آپ کو یاد نہیں؟"

"ہاں سنہ یاد نہیں ہے۔"

"اگر ۷۶ء میں آپ کی شادی ہوئی تھی تو کیا یہ کہنا غلط ہو گا کہ شادی سے پہلے ہی آپ ماں بن چکی تھیں۔"

"ہاں اگر ۷۵ء میں ہوئی ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو تو یاد نہیں۔ کیا میناکشی مندر میں کوئی ریکارڈ رہتا ہے شادیوں کا؟"

"جی نہیں۔ میرے خیال میں تو ریکارڈ نہیں رہتا۔"

"کیا اسی لیے آپ نے میناکشی مندر چنا تھا اپنی شادی کے لئے ۔ میناکشی مندر ہے کہاں؟"

"مدورا۔"

"اتنی دور آپ گئیں جب کہ اتنا بڑا مندر خود وژیاگ پٹنم میں موجود ہے؟ خیر یہ کیسے ہوا کہ چھ مہینے بعد ہی آپ کا بچہ کھو گیا۔"

"جی وہ گورنیس لے کر بھاگ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اچھی طرح سے۔ نیو ایر ڈانس ہو رہا تھا اس رات کو؟ جب ہم آئے تو وہ بچے سمیت غائب تھی۔"

"آپ نے پولیس میں رپورٹ کی تھی۔ وہ تو ریکارڈ میں ہونی چاہیے۔"

"جی نہیں۔ رپورٹ شاید نہیں کی تھی؟"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اس میں بدنامی ہوتی۔"

"بدنامی کیوں ہوتی؟"

"کیونکہ بچہ ذرا جلدی ہوگیا تھا۔ premature birth کہتے تھے ڈاکٹر صاحب۔"

"کون سے ڈاکٹر صاحب؟"

"ڈاکٹر ۔۔۔ نام تو یاد نہیں۔"

"شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں۔ ڈاکٹر کا نام آپ کو یاد نہیں۔۔۔ دودھ کتنے دِن پلایا تھا آپ نے؟"

"دودھ تو آج کل کوئی نہیں پلاتا۔"

"یقین ہے آپ کو؟ اگر میں لاکھوں عورتوں کو یہاں بلاکر یہی سوال پوچھوں کہ اُنھوں نے اپنے بچے کو دودھ پلایا کہ نہیں؟"

"وہ معمولی عورتیں ہوں گی۔ میرا مطلب تھا کہ سوسائٹی لیڈیز میں کوئی دودھ نہیں پلاتی۔"

"سوسائٹی لیڈیز سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"لیڈیز جو ہائی سوسائٹی کو belong کرتی ہیں۔"

"ہائی سوسائٹی کا مطلب؟"

"جو لوگ امیر ہیں۔ خوش حال ہیں۔ جن کے شوہر بڑی پوزیشن رکھتے ہیں۔"

"اچھا تو آپ کے شوہر کو بلانا پڑے گا۔"

مسٹر جے سوریہ کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا۔

"آپ کا نام؟"

"رماکانت جے سوریہ۔"

"کتنے عرصے سے آپ گولڈن شپنگ کمپنی میں ہیں؟"

"کوئی تین برس سے۔"

"اس سے پہلے کہاں تھے؟"

"وژیاگ پٹنم شپنگ یارڈ میں انجینئر تھا۔"

"کیا تنخواہ ملتی تھی؟"

"وہاں دو ہزار ماہوار۔"

"یعنی اب زیادہ ملتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کتنی ملتی ہے؟"

"چار ہزار روپے ماہوار۔ فلیٹ اور فری کار علیحدہ ہیں۔"

"یعنی چھ ہزار کے قریب ہوں گے۔"۔۔۔'' جی ہاں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر انکم ٹیکس میں چار ہزار پر ہی دیتاہوں۔"

"وژیاگ پٹنم آپ نے کیوں چھوڑا؟"

"بمبئی سے بہتر آفر آگئی۔"

"کوئی اور وجہ نہیں تھی؟"

"جی۔ ایک انکوائری ہوئی تھی۔ اس میں کچھ غلط فہمیاں تھیں۔"

"ان کی بنا پر آپ کو suspend کیا گیا؟"

"ہاں۔ آپ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں خود بھی resign کرنے کی سوچ رہا تھا۔"

"مگر پھر بھی آپ کو suspend کیا گیا؟ سچ سچ بتایئے۔"

"جی۔۔۔ہاں۔"

"کس کمپنی کانام لیا گیا تھا اس انکوائری میں جس کی بناپر آپ کو معطل کیا گیا؟"

"یاد نہیں۔ میں نے کہا نہیں کہ وہ غلط فہمیوں کی بناپر تھا۔"

"میں یاد دلاتاہوں آپ کو۔ کیا گولڈن شپنگ کمپنی کا نام لیا گیا تھا اس انکوائری میں۔"

"جی شاید۔"

"شاید نہیں۔ ٹھیک ٹھیک بتایئے۔ ورنہ مجھے کورٹ سے کہہ کر گورنمنٹ کا ریکارڈ منگوانا پڑے گا۔ یا میناکشی ٹیمپل کی طرح وہاں بھی ریکارڈ نہیں رکھے جاتے۔ کہیے گولڈن شپنگ کمپنی ہی تھی یا نہیں؟"

"جی ہاں شاید گولڈن شپنگ کمپنی ہی تھی؟"

"شاید نہیں۔ یقیناً۔"

مجسٹریٹ نے وکیل سے پوچھا :"آپ اِن سوالوں سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"جناب والا۔ میں مسٹر جے سوریہ کا کیریکٹر دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ ماں باپ بننے کے قابل ہیں کہ نہیں۔ بس ایک سوال اور ہے۔ مسٹر جے سوریہ آپ نے اپنی گورنیس کے خلاف پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں درج کرائی؟"

مسٹر جے سوریہ اس سوال کے لئے تیار نہیں تھے۔ بوکھلا گئے۔ "جی وہ بات یہ تھی کہ۔۔۔"پھر رُک گئے۔

"ہاں ہاں۔ بات کیا تھی؟"

"میں اس کو provoke نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"یعنی وہ ایسی باتیں جانتی تھی جو آپ کے کیریئر کو تباہ کرسکتی تھیں۔"

"جی ہاں۔ یہی سمجھیے۔"

"کیا آپ کے اس گورنیس سے کچھ خاص قسم کے تعلقات تھے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتایئے۔ ورنہ آپ کو contempt of court میں بھی دھرا جاسکتا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہی سمجھیے۔"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اگر آپ پولیس میں رپورٹ کرتے تو وہ بات باہر جاتی۔"

مسٹر جے سوریہ کا رنگ اڑ گیا۔

"جی ہاں۔ یہی سمجھیے۔"

"مطلب یہ کہ آپ نے اپنے بچے کو قربان کردیا اپنے کیریئر کی خاطر۔ اس وقت آپ کا خیال ہو گا کہ دوسرا بچہ ہوجائے گا، مگر آپ کے کوئی دوسری اولاد نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔"

"یہ آپ کو قدرت کی طرف سے سزا ملی۔ بس مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

اب نواب مغل مرزا اور اُن کی بیگم کی باری تھی۔

پہلے بیگم صاحبہ عدالت کے سامنے پیش ہوئیں۔

"آپ کا نام؟"

"مسز مہ ناز بیگم مغل مرزا۔"

"عمر کیا ہے؟"

"عورتوں کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔ یہ بیڈ مینرز کہلاتا ہے۔"

"بیگم صاحبہ یہ عدالت ہے۔ یہاں آپ کی سوسائٹی کے مینرز نہیں چلتے۔ ٹھیک ٹھیک بتایئے۔ کیا عمر ہے؟"

"کوئی پینتیس چھتیس کی ہو گی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کی عمر پینتالیس سال کی ہے تو آپ کیا کہیں گی؟"

"یہی کہوں گی کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں چالیس سے ایک برس بھی زیادہ نہیں ہوں۔"

"تھینک یو۔ میں بھی یہی جاننا چاہتا تھا۔۔۔ آپ کی شادی مرزا صاحب سے کس عمر میں ہوئی؟"

"جب میں تیس برس کی تھی۔"

"اور آپ کے شوہر۔ وہ کتنے سال کے تھے؟"

"وہ کوئی باون برس کے ہوں گے۔"

"یہ آپ کی پہلی شادی تھی؟"

"جی۔۔۔ نہیں۔" بیگم صاحبہ نے دھیمے سے کہا۔ "یہ میری دوسری شادی تھی۔"

"آپ کوئی بچہ بھی ساتھ لائی تھیں؟"

"جی ہاں ایک لڑکا۔"

"کیا عمر ہے اس کی اب؟"

"ماشاء اللہ اٹھارویں برس میں ہے۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟"

"اپنے ابا کا ہاتھ بٹاتا ہے، اُن کے بزنس میں۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے؟"

"تنخواہ کیوں ملتی؟ برابر کا پارٹنر ہے اپنے باپ کا۔"

"مگر مرزا صاحب اس کے باپ تو نہیں ہیں؟"

"اب تو وہی ہیں۔ اور کسی باپ کو وہ جانتا ہی نہیں۔"

"آپ کے پہلے شوہر کیا کرتے تھے؟"

"اس سے آپ کو کیا لینا ہے؟"

مجسٹریٹ نے بیگم صاحبہ کو تنبیہ کی کہ وکیل صاحب کے سوالوں کے صاف صاف جواب دیں۔

"اُن کی ہوٹل کی بزنس تھی۔"

"ہوٹل کی بزنس۔ کیا نام تھا اُن کے ہوٹل کا؟"

"اُن کے ہوٹل کا۔۔۔ اُن کے ہوٹل کا نام۔۔۔ دراصل وہ اُن کا ہوٹل نہیں تھا۔ وہ پارٹنر شپ میں چلاتے تھے۔"

"اُن کا پارٹنر کون تھا؟"

"اُن کے پارٹنر تھے۔۔۔ مرزا مغل بیگ۔"

"یعنی آپ کے موجودہ شوہر؟"

"جی ہاں۔"

"تو شاید آپ کی ملاقات مرزا صاحب سے پہلے سے ہو گی؟"

"ہاں۔ ہوٹل میں تو آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کے پہلے شوہر آپ کے موجودہ شوہر کے پارٹنر نہیں تھے، بلکہ ملازم تھے تو کیا یہ غلط ہو گا؟"

بیگم صاحبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بولیں:"جی ہاں۔ آپ ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل وہ ایک قسم کے مینجر تھے۔"

"اچھی طرح سے یاد کیجیے۔۔۔ مینجر تھے یا نان بائی تھے؟"

"تو کیا ہوا؟ مسلمانوں میں ذات پات نہیں چلتی۔ اُن کے ہاتھ میں ہنر تھا۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ننھے میاں کی نان کی شہرت تو بمبئی تک پہنچ چکی تھی۔ جب اُن کے انتقال کی خبر پڑھی تو ہم کو بھی افسوس ہوا تھا۔ یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"اللہ کی مرضی۔ نان نکال رہے تھےایک دن، تندور میں جاگرے۔"

"اس روز پہلی رپورٹ جو پولیس میں دی گئی تھی، اس میں تو لکھا ہے کہ کسی نے انھیں پیچھے سے دھکا دیا تھا۔"

بیگم صاحبہ اپنے سابق شوہر کی موت کے ذکر کو برداشت نہ کر سکیں۔ آبدیدہ ہوگئی اور عطر حنا سے معطر ایک فرانسیسی لیس کا رومال نکال کر آنسو پوچھنے پڑے۔

"معاف کیجیے۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھی عدالت میں بڑے تکلیف دہ سوال کرنے پڑتے ہیں۔۔۔ مگر دہلی کی عدالت میں یہ معاملہ کافی دنوں تک کھنچا تھا۔ مرزا صاحب کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔"

"جی ہاں۔ مالک کی حیثیت سے گواہی دینی پڑی تھی انھیں۔"وکیل نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔ "گواہ کی حیثیت سے نہیں ملزم کی حیثیت سے۔"

اس کی نگاہ اب نواب مرزا پر گئی جو گھبرا کر اپنی کرسی سے اٹھ رہے تھے۔"نواب صاحب تشریف رکھیے۔ ابھی آپ سے بھی چند سوال کرنے ہیں۔"

مرزا صاحب نے بھی اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پوچھنے لگے۔

اب نواب مرزا مغل کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا۔

"آپ کا نام؟"

"آپ جیسے نہیں جانتے؟"

"پھر بھی آپ کی زبان سے آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں؟"

"نواب مغل مرزا دہلوی۔"

"یہ مغل مرزا عجیب نام معلوم ہوتا ہے؟"

"ممکن ہے آپ کو عجیب نام معلوم ہوتا ہو۔ آپ کتنے اور مرزاؤں کو جانتے ہیں؟"

"میں تو ایک ہی مرزا کو جانتا ہوں۔ مرزا اسداللہ خاں غالب۔ اُن کو تو آپ بھی جانتے ہوں گے؟"

"غالب کو کون نہیں جانتا؟"

"اس لیے کہ غالب شاعر تھے۔ کوئی حقہ بردار نہیں تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے جدامجد کا نام کیا تھا جو بادشاہ کے رنگون جلاوطن ہونے کے بعد دہلی میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے؟"

"مرزا گل گل بیگ۔"

"کہ ایک گل تو ہم سمجھے۔ گل کے معنی گلاب کے پھول کے بھی تو ہوتے ہیں اور وہ گل بھی ہوتا ہے جو حقہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

"حقہ سے اس کیس کا کیا تعلق ہے؟"

"حقہ سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ تندور سے ہے۔ جہاں روٹیاں اور نان سینکی جاتی ہیں اور جس میں کسی وقت انسان کو پھینک دیا جائے تو منٹوں میں اس کا بھی کباب بن جاتا ہے۔"

نواب صاحب دہلی میں بڑی اونچی سوسائٹی میں گھومتے تھے۔ عہدیداروں کے ساتھ تاش کھیلتے تھے۔ اسی رُعب کو اس وقت استعمال کرکے اُنھوں نے مجسٹریٹ سے کہا :"یور آنر، اپنے وکیل کو سمجھایئے۔ سنبھل کے سوال جواب کرے ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"وکیل نے جلدی سے کہا، "اس کا بھی کباب بنادیا جائے گا۔"اور پھر اس نے مجسٹریٹ سے کہا :"یور آنر۔ میں جو الفاظ استعمال کر رہا ہوں یہ دہلی کی پہلی عدالت کی رپورٹ میں موجود ہیں، اگرچہ سیشن کورٹ نے مرزا صاحب کو benefit of doubt دیتے ہوئے رہا کردیا۔ صرف benefit of doubt۔ مگر doubt تو رہا اور رہے گا۔"یہ سب سُن کر نواب صاحب دھیمے پڑے۔

وکیل نے اب ترپ کا اِکہ نکالا۔"آپ کے نان بائی کا حادثہ کس سال میں ہوا تھا؟"

"سنہ چھیتر میں۔"

"شاید اپریل کا مہینہ تھا؟"

"شاید"نواب صاحب نے اقرار کیا۔

"اور پہلی مئی کو آپ کی شادی خانہ آبادی مرحوم نان بائی کی خوبصورت بیوہ سے ہوگئی اور صرف پانچ مہینے بعد اُن کی گود میں ایک بچہ کھیلنے لگا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ پہلے بھی شادی شدہ تھی۔"

"مگر دہلی کی عدالت میں یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ قتل، سوری موت سے چھ مہینے پہلے سے شہناز بیگم کے تعلقات اپنے شوہر کے ساتھ منقطع ہوچکے تھے۔"

نواب صاحب کو پسینہ آرہا تھا۔ وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر پیشانی پوچھنے لگے۔

"معاف کیجیے نواب صاحب کہ مجھے بعض ذاتی سوال بھی پوچھنے پڑے۔ اب آپ تشریف رکھ سکتے ہیں۔۔۔ اب میں بیگم صاحبہ کو پھر تکلیف دوں گا۔"

بیگم صاحبہ پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش ہوئیں۔

"بیگم صاحبہ۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ بچہ آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔"

"کچھ شک ہے آپ کو؟ آپ کا بچہ کیسے اور کب کھویا گیا تھا؟"

"کوئی آٹھ مہینے کا ہوگا اس وقت وہ۔ یہ نومبر ۷۶ء کی بات ہے۔ اس کی گورنیس مس ولیم حسب معمول اس کو پرام میں بیٹھاکر پارک میں لے گئی تھی۔ وہاں پارک کی ایک بینچ پر وہ بیٹھ گئی اور پرام اپنے قریب کرلیا۔ وہاں اُن کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو پرام خالی تھا۔ بچہ اس میں نہیں تھا۔۔۔

جب مجھے پتا چلا تو میں نے پولیس کو فون کیا۔ نواب صاحب کو کلب میں فون کیا۔ وہ پولیس افسروں کو ساتھ لے کر آئے، اُنھوں نے مجھ سے اور نواب صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کس پر شبہ ہے؟ ہم نے کہا کہ بچہ کڈنیپ تو کیا جاسکتا ہے مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ خدا نے کھیلنے کے لئے ایک کھلونا دیا تھا، شاید اب واپس لے لیا۔"

"کتنے عرصے کھیلی تھیں اس کھلونے سے آپ؟"

"کوئی وقت مقرر تھوڑا ہی تھا۔ جب وقت ملتا تھا میں نرسری میں ہو آتی تھی۔ تو بچے کا زیادہ تر وقت مس ولیم کے پاس ہی گزرتا تھا۔"

"اب مس ولیم کہاں ہیں؟"

"وہ انگلینڈ واپس چلی گئیں ہیں۔"

"بس اب مجھے کوئی سوال نہیں کرنا۔"

بیگم صاحبہ اپنی اونچی ایڑی کے جوتوں کو کھٹکھٹاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"اب حضور فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سی ماں اس بچے کی جائز حق دار ہے۔ "وکیل یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے کچھ ہنگامے کی آوازیں آئیں اور اگلے لمحے ایک عورت جو شکل صورت سے بھکارن لگتی تھی اور شاید پاگل بھی، میلی پھٹی ہوئی ساری پہنے عدالت میں بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی،"ہجور ہماری ارج بھی سن لیں۔ یہ بچہ ہمارا ہے۔ پولیس نے جبردستی ہم سے چھین لیا اور کہا کہ تو چراکر لائی ہے۔"

"تم کچھ بیان دینا چاہتی ہو تو گواہوں کے کٹہرے میں آؤ اور کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔"وکیل نے اس سے کہا اور پھر مجسٹریٹ سے،"جناب والا !اب

تک تو دو مائیں تھیں، اب تین ہوگئیں ہیں۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ میں اس سے بھی سوال کرتا ہوں۔"

"اپنا نام بتاؤ۔"

"بھکارن ہجور۔ بچپن سے یہی نام سنا ہے۔"

"تمہارا دھرم ذات کیا ہے؟"

"ہجور دھرم میرا روٹی کا ٹکڑا ہے اور جات سے بھکارن ہوں۔"

"بچہ تمہارے پاس کیسے آیا؟"

"بچہ جیسے آتا ہے، ہجور ویسے ہی آیا۔ میرے پیٹ سے نکلا۔"

"کیا تمہاری شادی ہوئی ہے؟"

"ہجور بھکارنوں کے شادی بیاہ کہاں ہوتے ہیں؟۔۔۔ مگر ایک بڑا خوبصورت سا صاحب ایک رات میرے پاس آیا نشے میں دھت تھا۔ کہنے لگا کہ بھکارن تجھے کیا چاہیے۔ میں نے کہا۔ ایک بچہ۔ کہنے لگا ایک بچہ۔ روپیا پیسا کچھ نہیں چاہیے۔ ساری بھی نہیں چاہیے؟۔۔۔ میں نے کہا صاحب۔ نہیں مجھے تو بس ایک بچہ چاہیے۔ کیونکہ بچے کے بنا مجھے لگتا ہے کہ میں ادھوری ہوں۔"

"تم نے اس صاحب سے کتنا روپیا لیا؟"

"روپیا کیوں لیتی۔ نو مہینے بعد۔ میں ادھوری سے پوری ہوگئی۔ سرکار عورت بچہ جننے کے بعد ہی پوری ہوتی ہے۔۔۔ ورنہ تو اس کا جیون ہی ادھورا ہوتا ہے۔"

"وہ صاحب تمہیں پھر ملا؟"

"نہیں صاحب۔ میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ تو مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔ مگر میں پھر بھی اس کی آبھاری ہوں کیونکہ اس کے کارن میں پوری ہوگئی۔ ماں بن گئی۔"

"کہاں ہے تمہارا بچہ؟"وکیل نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

"وہ ہے۔"بھکارن چلائی ادھر اشارہ کرتے ہوئے جہاں نئے کپڑے پہنے، بچہ کورٹ میں بیٹھا ہوا سب باتیں سن رہا تھا۔

جرح ختم ہوگئی تھی۔

وکیل نے مقدمہ کاخلاصہ سناتے ہوئے کہا :"یور آنر یہ مقدمہ کنگ سولومن کے انصاف کی یاد دلاتا ہے۔ وہاں تو دو مائیں تھیں جو دونوں ایک بچے کی ماں بننے کا دعوا کر رہی تھیں۔ یہاں تین مائیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا کہنا ہے کہ بچہ اس کا ہے۔ ایک بمبئی کے بڑے انجینئر کی بیوی ہے۔ ایک دہلی کے رئیس اعظم کی بیگم ہے۔ ایک بھکارن ہے۔ کنگ سولومن نے تو انصاف یہ کیا تھا کہ دونوں ماؤں سے کہا تھا کہ بچہ کو تلوار سے آدھا کرکے دونوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے گا۔ جس نے اس ظالمانہ انصاف سے بچے کی جان کی خاطر انکار کردیا وہی اس کی اصلی ماں قرار دی گئی۔ لیکن ہم اس بچے کے تین ٹکڑے کرنے کو بھی نہیں کہہ سکتے اس لیے کوئی اور فیصلہ کرنا پڑے گا جواَب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

مجسٹریٹ نے کہا :"ہم سب حیوان کی اولاد ہیں۔ جتنا چھوٹا بچہ ہوگا اتنا ہی وہ جانوروں کے قریب ہوگا۔ بچھڑا ہو یا ہرن کا بچہ وہ اپنی ماں کو سونگھ سکتا ہے۔ اس لیے اس مقدمہ کا فیصلہ بھی اس بچے کی ناک کرے گی۔" پھر بچے سے مخاطب ہوکر کہا :"بچے۔ یہ تین عورتیں کہہ رہی ہیں کہ وہ تمہاری ماں ہیں۔ تم اُن کے پاس جاؤ۔ اُن میں سے ہر اک کو سونگھو اور جو تمہاری ماں ہے اس کو پہچان لو۔"

بچہ پہلے مسز جے سوریہ کے پاس گیا۔"مائی چائلڈ۔"اُنھوں نے کہا اور اسے اپنے گلے لگالیا۔ اُن کی چھاتی سے اور اُن کی ساری سے بچے کو ایک تیز فرانسیسی سینٹ کی خوشبو آئی۔

"نہیں۔"اس نے کہا۔

پھر وہ بیگم مغل مرزا کے پاس گیا۔

اُنھوں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اُن کی پوشاک سے اور اُن کے سارے بدن سے عطر حنا کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو بھی بچے کے لئے غیرمانوس تھی۔ وہ اُن سے بھی الگ ہوگیا۔

"نہیں۔"اس نے پھر کہا۔

پھر وہ بھکارن کی طرف گیا۔ بھکارن نے اِس ڈر کے مارے اسے گلے نہیں لگایا کہ اس کے اندر سے میلے کپڑوں اور پسینے کے بھپکے آرہے تھے، لیکن بچے کی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑائے۔ اس لیے کہ بھکارن کے اندر سے پسینے کی بدبو کے علاوہ ماں کی مامتا کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی آرہی تھی۔

"ماں۔"اس نے کہا اور دوڑ کر بھکارن کے گلے لگ گیا۔

بھکارن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

سرکاری وکیل کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

مجسٹریٹ نے عینک کو رومال سے صاف کرنے کے بہانے اپنی آنکھوں کے آنسو پوچھ لیے کیونکہ انصاف کی دیوی تو اندھی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھ میں نہ نظر ہوتی ہے، نہ آنسو۔

﴿خواجہ احمد عباس، نیلی ساری، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، سن اشاعت دسمبر ۱۹۸۲ء، ص۱۶۔۳۷﴾

خواجہ احمد عباس

ماں کا دل

ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ سٹوڈیو میں حسب معمول ہنگامہ تھا۔ ہیرو کے سر پر نقلی بالوں کی "وِگ" بٹھائی جارہی تھی۔۔۔ ہیروئن بار بار آئینہ میں اپنی لپ سٹک کا معائنہ کر رہی تھی۔ ڈائریکٹر کبھی ڈائیلاگ رائٹر سے الجھ رہا تھا تھا کبھی کیمرہ مین سے۔ پروڈکشن منیجر اکسٹرا سپلائر سے ایک کونے میں اپنی کمیشن طے کر رہا تھا۔

کیمرہ مین کے اسسٹنٹ نے روشنیوں کے کالے شیشے میں سے دیکھ کر کیمرہ مین سے کہا: "شاٹ ریڈی۔" کیمرہ مین نے اپنے کالے شیشے میں سے سین کا معائنہ کرکے ڈائریکٹر سے چلا کر کہا: "شاٹ ریڈی۔" ڈائریکٹر نے ہیرو کی کرسی کے پاس جاکر دھیرے سے کہا: "شاٹ ریڈی۔" ہیرو نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر دو آئینوں میں اپنے سر کو آگے پیچھے سے دیکھا۔ وِگ کو دو تین بار تھپ تھپایا۔ نقلی بالوں کی ایک لٹ کو ماتھے پر گرایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی طرف دی جوڈائیلاگ کا فائل لیے کھڑا تھا ہیرو نے پوچھا: "پکچر کون سی ہے؟"

"ماں کا دل۔"

"سین کون سا ہے؟"

"جی یہ وہ بچے والا سین ہے۔"

"بچے والا سین؟ مگر اس فلم میں تو میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ بچہ کیسے ہو گیا؟"

"جی نہیں یہ آپ کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ راستہ چلتے آپ کو ایک لاوارث بچہ مل جاتا ہے۔ بچے کو دیکھ کر آپ کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے، اپنی ماں یاد آجاتی ہے، آپ بچے کو گود میں اٹھالیتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور آپ بولتے ہیں۔۔۔"

"ہاں تو ڈائیلاگ سناؤ۔"اور یہ کہہ ہیرو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ڈائیلاگ ڈائریکٹر نے فوراً فائل کھول کر پڑھنا شروع کیا۔"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھ کا نور ہے۔۔۔"ہیرو نے پوچھا:"نور؟ نور کیا ہوتا ہے؟"ڈائیلاگ ڈائریکٹر نے پنسل سے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا:"جی۔ نور۔ نور تو بس نور ہوتا ہے۔ جیسے نور محمد، نور الحسن وغیرہ۔ دراصل رائٹر نے نور کا قافیہ سرور سے ملایا ہے۔"

"پورا ڈائیلاگ پڑھو۔"

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھوں کا نور ہے، کسی کے دل کا سرور ہے، اگر آج یہ بھوکا ہے، مجبور ہے تو یہ سماج کا قصور ہے۔ کل یہی بچہ بڑا ہوکر ڈاکٹر، وکیل یا لیڈر بن سکتا ہے۔۔۔"

"یہ سب کیا بکواس ہے؟"ہیرو نے کہا اور پھر ڈائریکٹر کی طرف مخاطب ہوکر"اتنا بڑا ڈائیلاگ مجھے یاد بھی نہیں ہوگا۔"

ڈائریکٹر نے کہا:"مجھے بھی ڈائیلاگ ضرورت سے زیادہ لمبا لگتا ہے۔" اور پھر ڈائیلاگ ڈائریکٹر سے"کمار صاحب جیسا کہتے ہیں اسے چھوٹا کردو۔" ڈائیلاگ ڈائریکٹر نے ڈائیلاگ کے پورے صفحے پر نیلی پنسل سے کانٹی کا نشان بناتے ہوئے کہا:"کمار صاحب آپ ہی بتایئے نا۔"ہیرو نے سوچ کر کہا:"تو لکھو۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔۔۔"

"جی؟ آگے؟"

"بس اور کچھ نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

ڈائیلاگ ڈائریکٹر نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے:"یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔ واہ واہ کیا بات کہی ہے۔ کمار صاحب آپ کو تو رائٹر ہونا چاہیے تھا۔"اور پھر ڈائریکٹر سے مخاطب ہوکر"سر یہ تو پکچر کا تھیم ڈائیلاگ ہوگیا۔"

"تو پھر چلیے شاٹ تیار ہے۔"ڈائریکٹر نے ہیرو کو اشارہ کیا اور جیسے ہی ہیرو اپنی کرسی سے اٹھا اور سب بھی کھڑے ہوگئے۔

"بچہ لاؤ۔"پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی آواز گونجی۔"بچہ لاؤ۔"دوسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا۔"بچہ لاؤ۔"تیسرے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے آواز دی۔

"سپلائر!"پروڈکشن منیجر نے نعرہ لگایا،" بچہ کہاں ہے؟"

"مسز جانسن۔"اکسٹرا سپلائر چلایا۔

ایک موٹی تازی اینگلو انڈین عورت جو نہ جوان تھی، نہ بوڑھی، آگے بڑھی۔ اس کی گود میں ایک بھورے بالوں والا گول گول چہرے گول گول آنکھوں والا بچہ تھا جو نائلون کا فراک پہنے ہوئے تھا۔

"اس کا فراک تو بہت بڑھیا لگتا ہے۔ غریب بچے کا فراک ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"تیسرے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اعتراض کیا،"ستیہ جیت رے کی فلموں میں دیکھیے کتنی ریالزم (Realism) ہوتی ہے۔"

"ڈریس مین!"دوسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا۔"جی صاحب"ڈریس مین نے جواب دیا:"بچے کا فراک بدلی کرو۔ کوئی میلا پھٹا ہوا کپڑا پہناؤ۔"پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے حکم دیا۔ڈریس مین نے ایک بکسے میں ہاتھ ڈالا اور چند میلے گندے چیتھڑے لیے ہوئے بچے کی طرف بڑھا۔بچے کی ماں نے جیسے ہی ان گندے چیتھڑوں کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے بچے کو اپنی چھاتی

سے لگا لیا،"نو۔نو۔ ہمارا بے بی ایسا ڈرٹی کپڑا نہیں پہنے گا۔ کوئی بیماری لگ گئی تو۔۔۔"

"مگر میم صاحب دیکھیے ریالزم (Realism) کے لئے ضروری ہے۔" تیسرے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہنا شروع کیا۔بچے کی ماں بات کاٹتے ہوئے بولی:"ہمارا بےبی اونلی ہائی کلاس پکچرز میں کام کرتا ہے۔ہم سپلائر کو پہلے ہی بولا تھا ہمارا بےبی گندا کپڑا نہیں پہنے گا۔"ڈائریکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا:"رہنے دو۔ آج کل غریبوں کے بچے بھی نائلون کے کپڑے پہنتے ہیں۔"کیمرے کے سامنے کھڑے ہوئے ہیرو نے میم صاحب کی گود کی طرف ہاتھ پھیلائے،"کم آن بےبی۔"بچہ ہمک کر ہیرو کی گود میں چلا گیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ فلمی دنیا کا محاورہ ہے کہ شوٹنگ کرتے وقت تین مصیبتیں آسکتی ہیں۔ گھوڑا، کتا اور بچہ۔

میم صاحب نے اپنے بھورے گھنے بالوں کو تھپکی دیتے ہوئے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:"ہمارا بے بی سویٹ ہے نا؟ بڑا ہوکر یہ بھی فلم کا ہیرو بنے گا۔"کیمرہ مین نے ایک لائٹ کو بائیں سے ذرا دائیں سرکایا پھر واپس بائیں کو سرکاکر اسی جگہ رکھ دیا۔ پھر کیمرہ کی آنکھ میں جھانک کر دیکھا:"کمار صاحب ذرا آگے۔۔۔ بس بس بس۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔"اور پھر چلاکر"ریڈی فار ساؤنڈ ٹسٹ۔"ساؤنڈ اسسٹنٹ نے مائکروفون آگے بڑھایا "کمار صاحب۔ ڈائیلاگ بولیے گا ایک بار۔"ہیرو نے مائیکروفون کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھا اور کہا:"یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

"ہاوزیٹ؟"تینوں اسسٹنٹ ایک ساتھ چلائے جیسے کرکٹ کے میدان میں کسی کھلاڑی کو (L.B.W) کرنے کے لئے سب فیلڈرز چلاکر امپائر سے پوچھتے ہیں:"ہاوزدیٹ۔"ساونڈ روم سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے جواب آیا:"اوکے۔ ریڈی فار ٹیک۔"

پہلا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا:"خاموش۔"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا:"سائلنس!"

تیسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا:"بات چیت بند۔"

ڈائریکٹر نے کہا:"ساؤنڈ سٹارٹ۔"

ساؤنڈ روم سے جواب آیا:"کیمرہ۔"

کیمرہ میں نے بٹن دباکر کہا:"رننگ۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ پھر کیمرے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر بولا:"یہ بچہ بھی کسی۔۔۔"ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بچے نے ہیرو کے ماتھے پر گری بالوں کی لٹ پر ایک جھپٹا مارا اور"وگ"اس کے ہاتھ میں آگئی۔ ہیرو کی گنجی چندیا سٹوڈیو لائٹس کی روشنی میں چمک اٹھی۔

ڈائریکٹر گھبراکر چلایا:"کٹ !کٹ!"

پہلا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا:"کٹ اِپ!"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا:"کٹ اِپ!"

تیسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا:"میک اَپ، ہیرڈریسر کو بلاؤ۔"

تین نوجوان کالج کی لڑکیاں جو کمار کی"فین" تھیں اور خاص طور سے اس کی شوٹنگ دیکھنے آئی تھیں یہ دیکھ کر بھوچکا رہ گئیں کہ اُن کے محبوب ایکٹر کے سر کی چندیا بالکل صاف تھی۔۔۔ اور انڈے کی طرح سفید۔

"ہائے رام!"ایک نے دوسری سے کہا:"یہ تو گنجا ہے!"

دوری نے"ش ش ش"کر کے کہا:"آہستہ بولو کہیں سن نہ لیں۔"

کمار غصے میں سیدھا سٹوڈیو کے باہر جاچکا تھا اور اب اس کے پرائیوٹ میک اَپ روم میں ہیئر ڈریسر دوبارہ اس کی "وِگ" کو فٹ کر رہی تھی۔

"اس بار میں چار ہیر کلپ لگادیتی ہوں تاکہ کھینچنے پر بھی وگ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔" مگر کمار نے غصے سے کہا: "میں اس بچے کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔" جب دوبارہ وِگ لگواکر ہیرو واپس سٹوڈیو میں پہنچا تو ڈائریکٹر بےبی کی ممی سے کہہ رہا تھا: "سوری میم صاحب۔ آپ کے بچے کو اب چھٹی۔ آگے کسی سین میں ہم ضرور اس کے لئے کوئی کام نکالیں گے۔"

"دیٹس آل رائٹ (That's All Right) میم صاحب بولیں۔ ہم کو مالوم ہے شوٹنگ میں ایسا گول مال ہوجاتا ہے۔ اپنے منیجر کو بولو ہمارا چکتا کردو۔"

پروڈکشن منیجر نے اکسٹرا سپلائر کو ساٹھ روپے دے کر پچھتر روپے کی رسید لی۔ سپلائر نے میم صاحب کو چالیس روپے دے کر پچپن کی رسید لی۔ میم صاحب بچے کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہی تھیں کہ بے بی نے ایک اور جھپٹامارا اور اپنی ماں کے سر سے اس کی "وِگ" بھی کھینچ لی۔ میم صاحب نے جلدی سے اپنے نقلی بالوں کو دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا اور جب اطمینان ہوگیا تو بولیں: "یوناٹی بےبی۔ ڈرائیور ہم کو دادر سٹیشن چھوڑ دینا۔ ادھر سے ہم بائیکلہ ٹرین میں جائے گا۔"

سٹوڈیو میں پھر ہنگامہ تھا۔

ڈائریکٹر پہلے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا: "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پہلا اسسٹنٹ پروڈکشن منیجر سے کہہ رہا تھا: "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پروڈکشن منیجر نے اکسٹرا سپلائر کو کونے میں لے جاکر کہا: "آج تو تیری چاندی ہو رہی ہے۔ ایک بچہ اور لے آ۔ جتنا شریر ہو اچھا ہے۔ ایک دو اور بچوں کا بھی انتظام کر رکھنا۔"

اکسٹرا سپلائر پروڈیوسر کی موٹر لے کر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک تین چار برس کا موٹا تازہ بچہ لے کر آگیا۔ ساتھ میں ایک کالا سا موٹا سا لمبے لمبے بالوں والا پہلوان نما آدمی۔ دھاریوں والی بنیان اور چارخانے کا تہمد باندھے۔

"ہم حاضر ہیں جی۔"پہلوان نما آدمی نے ڈائریکٹر کو ایک فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"آپ نے نہیں پہچانا۔ میں ماسٹر گٹھل ہوں۔ انڈسٹری کا پرانا آدمی ہوں۔ شہزادہ گلفام میں ولین کیا ہے۔ باغی شہزادی میں سائڈ ہیرو تھا۔ لال گھوڑا میں سائڈ ولین۔ اب بھی کیرکٹر کرلیتا ہوں۔ بولیے کیا حکم ہے؟ ہم حاضر ہیں۔"ڈائریکٹر نے چڑ کر کہا:"بھئی ہمیں اس وقت صرف ایک بچے کی ضرورت ہے۔"

"بچہ بھی حاضر ہے سرکار۔"یہ کہہ کر پہلوان نما آدمی نے بچے کو آگے کردیا۔

"اے ڈائریکٹر صاحب کو سلام کرو۔"

بچہ ہرے رنگ کی مخمل کا نیکر اور بش شرٹ پہنے تھا۔ ہاتھ میں ایک جھنجھنا لیے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو چھوٹے قد کا بنا دیا ہو۔ باپ کا حکم سنتے ہی اس نے بھی ایک فوجی سلام کیا اور ماتے سے ہاتھ نہ ہٹایا جب تک باپ نے اگلا حکم نہ سنایا:"ابھی صاحب کو ٹوسٹ کرکے بتاؤ بیٹا۔"اور وہ بچہ جس کا چہرہ بچوں جیسا نہ تھا۔ دفعتاً ٹوسٹ کرنے لگا جیسے وہ چابی والی گڑیا ہو۔

"شاباش بیٹا۔ شاباش۔"باپ ٹوسٹ کی لے پر تالیاں بجاتا ہوا بولا۔ بچہ تھرک رہا تھا۔ اپنے کولہے مٹکارہا تھا۔ کبھی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی پیچھے ہٹتا تھا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔ آہستہ آہستہ سیٹ پر جتنے لوگ جمع تھے وہ بچے کا ٹوسٹ ڈانس دیکھنے لگے۔ کیمرہ مین، اس کے اسسٹنٹ،لائٹوں والے چھوٹے موٹے کیرکٹر ایکٹر، اکسٹرا۔تب پروڈیوسر نے ڈائریکٹر کے کان میں کہا:"یہ سب بند کرو۔ کمار جی کو دن بھر کی شوٹنگ کا دس ہزار دینا ہے اور شارٹ اب تک ایک نہیں ہوا۔"

ڈائریکٹر نے چلاکر کہا: "کٹ اِٹ۔"ٹوسٹ ڈانس کرتے کرتے بچہ ایک دم رک گیا۔ جیسے اس کی چابی ختم ہوگئی ہو۔ڈائریکٹر نے پہلے اسسٹنٹ کو حکم دیا:"کمار جی کو بلاؤ۔"پہلے اسسٹنٹ نے دوسرے اسسٹنٹ کو حکم دیا: "کمار جی سے کہو بچہ آگیا ہے۔ شاٹ تیار ہے۔"تیسرا اسسٹنٹ میک اپ روم کی طرف بھاگا۔ہیرو نے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی پوچھا:"بچہ کہاں ہے؟" ہری رنگ کی نیکر والے بچے نے ہیرو کو فوجی سلام مارتے ہوئے کہا:"گڈ مارننگ، ہاؤڈویوڈو؟"اور یہ کہہ کر ہیرو کی طرف دیکھ کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ ہیرو گھبراکر پیچھے ہٹ گیا اور سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ہیرو نے بچے سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا:"کیوں پہلوان کام کروگے؟ گھبراؤگے تو نہیں۔"

بچے نے تتلاتے ہوئے جواب دیا:" گھبلائیں گے تو آپ؟"اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہیرو نے کھسیانا ہوکر پوچھا:"کیا اس آفت کے پرکالے کو مجھے گود میں اٹھانا ہوگا؟"کیمرہ مین چلایا:"ریڈی فار ٹیک۔"مختلف آوازیں سٹوڈیو میں گونجیں:"ریڈی فار ٹیک۔ آل لائٹس۔ میک اپ ہیر ڈریسر۔ ساؤنڈ ٹسٹ۔"ہیرو نے کہا:"ٹھہرو بھائی۔ پہلے میں اس پہلوان کو اٹھاکر دیکھتا ہوں۔" ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔۔۔ لیکن بچہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ ہیرو ہانپنے لگا۔

"ساؤنڈ اسٹارٹ"ڈائریکٹر نے آواز دی۔

"کیمرہ"ساؤنڈ ریکارڈ سٹ کی آواز آئی۔

"رننگ!"کیمرہ مین نے اعلان کیا۔

ہیرو نے بچے کی طرف پیار بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بچے نے آنکھ ماری۔ ہیرو کی زبان سے نکلا:"یہ بچہ بھی۔۔۔ یہ بچہ بھی۔۔۔"اور پھر اس کے بجائے بچہ بولا:"کیوں بیٹا ڈائیلاگ بھول گئے نا؟"ہیرو کو ایسا لگا جیسے اس کی گود میں آدمی کا بچہ نہ ہو، کسی راکشش کا بچہ ہو اور اس نے"کٹ اِٹ"کہہ کر بچے کو اس کے باپ کی طرف پھینکا۔اور سو پہلوان صاحب بھی دس دس روپے کے چھ نوٹ جیب میں ڈال کر بچے کا ہاتھ پکڑے وہاں سے رخصت ہوگئے۔

تیسرا بچہ لایا گیا۔ اس نے شاٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ہیرو کے سوٹ پر پیشاب کردیا۔۔۔ ہیرو نے کہا میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔چوتھا بچہ لایا گیا۔ یہ دیکھنے میں بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ سب کو یقین تھا، اب شاٹ بخیر و خوبی ہوجائے گا لیکن جیسے ہی ہیرو نے اسے گود میں لیا، بچہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ بچے کو ماں کی گود میں واپس دیا گیا تو فوراً چپ ہوگیا۔ دوبارہ ہیرو کی گود میں دیا تو چپکے سے چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی کیمرہ چلنا شروع ہوا اور ہیرو نے ڈائیلاگ بولا:"یہ بچہ بھی۔۔۔" کہ بچے نے نہ صرف رونا شروع کردیا بلکہ اپنے ننھے سے پاؤں سے اتنے زور کی لات ماری کہ ہیرو کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی۔۔۔ ہیرو نے فیصلہ سنادیا۔

"میں اس بچے کے ساتھ بھی کام نہیں کروں گا۔ یا تو کوئی سیدھا سادا چپ چاپ بچہ لاؤ۔ نہیں تو سین کینسل کرو۔ گھنٹہ بھر میں شوٹنگ شفٹ بھی ختم ہونے والی ہے۔"

سپلائر نے کہا:"اب میں کب تک بچے لاتا رہوں۔ اس طرح توساری بمبئی کے بچے ختم ہوجائیں گے۔"

پروڈکشن منیجر نے کہا:"تجھے کیا؟ تیری تو چاندی ہو رہی ہے۔۔۔"

"اور تمہاری نہیں؟"سپلائر نے چڑ کر کہا۔

"اچھا بھئی ہم دونوں کی۔ اب ایک چپ چاپ سا بچہ لے آ کہیں سے۔"

"میں تو جتنے فلمی بچوں کو جانتا ہوں سب کو لے آیا۔ ہر ماں اپنے بچے کو فلم میں کام کرنے نہیں بھیجتی۔ یہی دوچار لوگ ہیں جو اپنے بچوں کا دھندا کرتے ہیں۔"

"ارے بھئی پیسوں کی خاطر کوئی بھی اپنے بچے کا دھندا کرسکتا ہے۔"یہ بات کرتے کرتے وہ سٹوڈیو کے باہر نکل آئے تھے۔ جہاں ایک بھنگن سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔

"اری ذرا ٹھہر۔"پروڈکشن منیجر چلایا:"سارے میں مٹی اڑا رہی ہے۔ یہ وقت ہے جھاڑو دینے کا۔ صبح سویرے کیوں نہیں جھاڑودی۔"

"بابوجی۔ آج مجھے دیر ہوگئی تھی۔"

"دیر ہوگئی تھی تو پگھار کٹے گی۔ کوئی مفت کام کرتی ہے کیا؟"

"بابوجی۔"بھنگن کام بند کرکے گڑگڑاتی ہوئی بولی:"میرا بچہ بیمار ہے۔"

"بیمار ہے۔ کیا بیمار ہے؟"

"بابوجی۔ پتہ نہیں کیا بیمار ہے۔ دس دن سے بکھار نہیں اترا۔"

"تو پھر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتی؟"

"محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا، بابوجی۔ دو روپے فیس بھی دی تھی۔ وہ کہیں اسے بچوں والے بڑے ڈکٹر کو دکھاؤ۔ اُن کی فیس بیس روپے ہے۔ پھر دو انجکشن کے لئے بھی دام چاہئیں۔ اگلے مہینے کی پگھار مل جاتی۔۔۔ تو بچے کا اِلاج ہوجاتا۔"

"جا بچے کو لے آ۔ اس کے علاج کے لئے روپے مل جائیں گے۔ پورے چالیس۔" اکسٹرا سپلائر نے پروڈکشن منیجر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ پروڈکشن منیجر بولا: "اری تیرے بچے کا فلم میں فوٹو آجائے گا کمار جی کے ساتھ اور پیسے بھی ملیں گے جلدی سے لے آ۔"

"ابھی لاتی ہوں، بابوجی۔۔۔" بھنگن نے جھاڑو ٹوکری پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر سن، بچہ روئے گا چلائے گا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ چپ چاپ رہنا چاہیے۔"

بھنگن سٹوڈیو کے پیچھے ہی ایک جھونپڑیوں کی بستی میں رہتی تھی۔ اپنی جھونپڑی میں جانے سے پہلے اس نے پڑوسن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کیا ہے چاؤلی؟"

"بچہ بہت روتا ہے بہن۔ مجھے کام پر جانا ہے۔ وہ دوا دے دو جو تم کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو دیتی ہو۔"

پڑوسن نے ایک پڑیا پکڑادی: "بس تھوڑی سی پانی میں گھول کر دیجئیو۔"

چاؤلی اپنے جھونپڑے میں گئی۔ بچہ جھنگا چارپائی پر اکیلا لیٹا رورہا تھا۔ چاؤلی نے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ بدن جل رہا تھا۔ روئے ہی جارہا تھا۔ چاؤلی نے بھینچ کر بچے کو پیار کیا۔'' نارو میرے لال۔ چل میں تجھے فلم کمپنی میں

لے چلتی ہوں۔ میرا بیٹا فلم کا ہیرو بنے گا۔ پھر تجھے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ ‘‘

"نارو میرے لال۔۔۔ نہ رو۔"یہ کہہ کر اس نے پانی میں گھلی ہوئی کالی کالی دوا بچے کو چٹادی۔۔۔ بچہ روتے روتے ہلکان ہوکر اب ہچکیاں لینے لگا تھا۔ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہوکر سوگیا۔ چاؤلی نے بچے کو چند چیتھڑوں میں لپیٹا اور سٹوڈیو کی طرف چل دی۔

اکسٹرا سپلائر نے کہا:"روئے گا تو نہیں۔"

چاؤلی نے کہا:"نہیں بابوجی مجے سے سو رہا ہے۔"

ڈائریکٹر نے پوچھا:"ارے یہ روئے گا تو نہیں؟"

پروڈکشن منیجر نے کہا:"نہیں صاحب۔ بڑا شریف بچہ ہے۔ ماں کا دودھ پی کر مزے سے سو رہا ہے۔ آپ جتنے چاہیں شاٹ لیجیے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لینے سے پہلے پوچھا:"روئے گا تو نہیں؟"

"نہیں کمار جی۔"ڈائریکٹر نے اسے یقین دلایا:"بڑا خاموش بچہ تلاش کرکے منگوایا ہے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لے لیا اور سوچا: "شکر ہے اس کا وزن زیادہ نہیں ہے۔"پھر وہ بولا:"جلدی شاٹ لے لو۔ ابھی تو سو رہا ہے اٹھ گیا تو یہ بھی ناک میں دم کرے گا۔"

"ریڈی فار ٹیک۔"

"ریڈی فار ٹیک۔"

"آل لائٹس۔"

"ساؤنڈ ریڈی؟"

"سٹارٹ ساؤنڈ۔"

"کیمرہ۔"

"رننگ۔ کلیپ۔"

"ماں کا دل۔ سین نمبر ۵۵ ۔ شاٹ نمبر سیون۔ ٹیک نمبر فور۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے کو دیکھا۔ بچہ اطمینان سے آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ہیرو نے کیمرہ کی طرف دیکھ کر دل کی گہرائی سے آواز نکالی: "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

شاٹ کٹ ہوگیا۔ مگر کیمرہ مین نے کہا ایک ٹیک اور چاہیے۔ بچے کے چہرے پر روشنی ٹھیک نہیں پڑی تھی۔ایک اور بار شاٹ دہرایا گیا۔ ایک بار پھر ہیرو نے کہا:"یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"اسی وقت ایک ہوائی جہاز سٹوڈیو کے اوپر سے گونجتا ہوا گزر گیا۔ لاؤڈ سپیکر میں سے ساؤنڈ رکارڈسٹ کی آواز آئی:"کٹ کٹ۔"ہوائی جہاز۔کسی نہ کسی وجہ سے تین بار اور شاٹ دہرایا گیا۔ ٹیک نمبر نو کو "اوکے"کیا گیا۔

ہیرو نے بچہ پروڈکشن منیجر کے حوالے کیا۔ بچہ اب تک سو رہاتھا۔پروڈکشن منیجر نے بچہ اکسٹرا سپلائر کی گود میں دیا۔اکسٹرا سپلائر نے چاؤلی کی گود میں بچہ دیااور ساتھ ہی چالیس روپے دے کر اس سے پچھتر روپے کی رسید پر انگوٹھا لگوالیا۔

"جا اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا اور اچھی طرح علاج کروا۔"

"بابوجی۔ سیدھی وہیں جاتی ہوں۔ ٹیکسی کرکے۔ آپ کی کرپا سے اس کا اِلاج ہوجائے گا۔ آپ کے بچے جئیں۔"

بچوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر کے سیکٹریری نے پہلے فیس لے لی۔ پھر ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کیا:"مگر یہ تو مرچکا ہے۔"ڈاکٹر نے ہاتھ لگاتے ہی کہا اور چاؤلی کو ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔ پھر بھی وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی:"ڈاکٹر صاحب کیا ہوا میرے لال کو۔ اسے تو صرف بکھار آرہا تھا۔"

"بخار سے نہیں، لگتا ہے تمہارا بچہ زہر سے مرا ہے۔ کیا دیا تھا اسے کھانے کو؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب !جراسی افیم دی تھی چپ کرانے کو۔"

سال بھر بعد"ماں کادل"کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک بڑے نیتا نے تقریر کرتے ہوئے کہا:"میں اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر، ہیرو اور ہیروئن کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُن کی فلم میں سچ مچ ایک ہندوستانی ماں کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔"

﴿رام لعل، خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، سیمانت پرکاشن، دریاگنج، نئی دہلی،۱۹۸۸سن اشاعت ء، ص۱۴۵۔۱۵۴﴾

پریم چند

﴿بدنصیب ماں﴾

﴿۱﴾

پنڈت اجودھیاناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا: "ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے۔" چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی، پختہ مکان، دو باغ، کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد۔ بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا لازمی تھا اور وہ کئی دن تک بے حال رہی لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اسے تشفی ہوئی۔ چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند، چاروں بہویں ایک سے ایک فرمانبردار۔ جس وقت پھول متی چارپائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پاؤں دباتیں۔ وہ اشنان کر کے اٹھتی تو اس کی ساڑھی دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑا لڑکے کامتاناتھ ایک دفتر میں پچاس کا نوکر تھا۔ دوسرا امانا تھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا۔ تیسرا دیاناتھ بی۔اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتاناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا۔ اور امسال بی۔اے اول درجے میں پاس کر کے ایم۔اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں وہ لاابالیاں نہ تھیں، نہ فضول خرچیاں، نہ کم اندیشیاں، جو والدین کو جلاتی ہیں اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں۔ بڑھیا گھر کی مالکن تھی اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی جو بڑھاپے کو سخت گیر بنا دیا کرتی ہے مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ بھی نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت جی کو مرے آج بارھواں دن تھا۔ کل تیرھویں ہے، برہم بھوج ہو گا، برادری کی دعوت ہو گی، اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھول متی اپنے حجرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ پلّے دار بوریوں میں آٹا لا کر رکھ رہے ہیں۔ گھی کے

ٹین آرہے ہیں، سبزی کے ٹوکرے، شکر کی بوریاں، دہی کی مٹکیاں، سب چلی آرہی ہیں۔ مہابر ہمن کے لئے دان کی چیزیں لائی گئیں، برتن، پلنگ، بستر ے، کپڑے وغیرہ مگر پھول متی کو کوئی چیز نہیں دکھائی گئی۔ حسبِ ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہیے تھیں اور وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی، اسے پسند کرتی، انکی مقدار میں کمی بیشی کرتی تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا۔ مگر اسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ اچھا، آٹا تین ہی بوری کیوں آیا، اس نے تو پانچ بوریوں کے لئے کہا تھا۔ گھی کے پانچ ہی کنستر آئے، اس نے دس کنستر منگوائے تھے۔ شاید سبزی، دہی، شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہو۔ کس نے اس حکم میں مداخلت کی، جب اس نے ایک بات طے کر دی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملے میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس نے سو کہا تو سو خرچ کیے گئے، ایک کہا تو ایک۔ کسی نے مین میکھ نہ کی۔ یہاں تک کہ پنڈت اجودھیاناتھ بھی سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے، پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے وہ اسے کیوں برداشت کر سکتی تھی؟

وہ کچھ دیر تو ضبط کیے بیٹھی رہی، پر آخر اس سے رہا نہ گیا۔ خود پروری اس کی فطرتِ ثانی بن گئی تھی۔ غصے میں بھری ہوئی آئی اور کامتاناتھ سے بولی، کیا آٹا تین بوری لائے، میں نے تو پانچ بوریوں کے لئے کہا تھا، اور گھی بھی پانچ کنستر، تمھیں یاد ہے میں نے دس کنستر کہے تھے۔ کفایت کو میں برا نہیں کہتی، لیکن جس نے یہ کنواں کھودا، اس کی آتما پانی کو ترسے تو کتنی شرم کی بات ہے۔

کامتاناتھ نے معذرت نہیں کی، عذرِ گناہ نہیں کیا، نادم بھی نہیں ہوا، فوراً تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا۔ ایک منٹ تو باغیانہ انداز سے کھڑا رہا، پھر بولا ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوریوں کی ہوئی اور تین بوریوں کے لئے پانچ کنستر گھی کافی تھا، اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کر دی گئیں۔

"پھول متی تیز ہو کر بولی: "کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟"

"ہم لوگوں کی رائے سے۔"

"تو میری رائے کوئی چیز نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں؟ لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم ہی سمجھتے ہیں۔"

پھول متی ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اپنا نفع نقصان۔ یہ "اپنا" کیا بلا ہے؟ اس کا وجود کب سے ہوا؟ اس کے نفع نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ دوسروں کو، خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں، اس کے فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ لونڈا اسطرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اس کا ہے۔ اس نے مر مر کر یہ گرہستی جمع کی ہے، میں تو غیر ہوں، ذرا اس کی خود سری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو، مجھے اختیار ہے میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں۔ ابھی جا کر دو بورے آٹا اور پانچ کنستر گھی اور لاؤ۔ اور آئندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی۔"

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہہ کر دی تھی اور وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ اپنے حجرے میں چلی آئی۔ حالانکہ کامتا ناتھ ابھی وہیں کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے سے مترشح ہو رہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے۔ مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی۔ اتنی تنبیہہ پر بھی کسی کو اس پر نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے، یہ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس پر اب حقیقت کھلنے لگی کہ اس گھر میں اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو دس بارہ روز پہلے تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں نوید میں گھی، شکر مٹھائی وغیرہ آ رہی تھی۔ بڑی بہو ان چیزوں کو خود خاص انداز سے سنبھال سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تینوں چھوٹی بہوئیں بھی بھنڈارے میں گھسی تھیں۔ کوئی بھی پھول متی سے کچھ پوچھنے نہیں آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں وہ کامتا ناتھ سے کچھ یا بڑی بہو سے۔ کامتا ناتھ کہاں کا بڑا مہتمم ہے، دن بھر بھنگ پیے پڑا رہتا ہے اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ حد ہو گی اور کیا سب

کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جائے گی۔ تب ادھر ادھر بھاگیں پھریں گے۔ ان کاموں کے لئے بڑا تجربہ اور سلیقہ چاہیے۔ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری پھرے گی۔ کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی تپل پر پہنچے گی کسی پر نہیں۔ آخر ان سبھوں کو ہو کیا گیا ہے۔ اچھا بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے۔ وہ سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے۔ کنجی اس کے پاس ہے ضرور، لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی۔ آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے، میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ اس نے بڑی بہو کے پاس جا کر تند لہجے میں کہا: "سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کہا۔"

"بڑی بہو نے بے باکانہ انداز سے کہا: "بازار سے سامان آیا ہے تو دام نہ دیئے جائیں۔"

"کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جب تک حساب نہ ہو جائے، روپے کیسے دیئے جائیں گے؟"

"حساب کتاب سب ہو گیا۔"

"کس نے کیا؟"

اب میں کیا جانوں، جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو۔"

پھول متی پھر آ کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گئی۔ اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا۔ گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ تو یہی کہیں گے، پنڈت کے مرتے ہی ان کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی۔ خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہے، جب مہمان رخصت ہو جائیں گے، تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی۔ دیکھیے اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ کارپردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ بارہ بجے

دعوت شروع ہوئی۔ ساری برادری کے لوگ یکبارگی کھانے کے لئے بلا لئے گئے۔ پھول متی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ صحن میں مشکل سے ڈھائی سو آدمی بیٹھ سکتے تھے، یہ ساری برادری کیسے بیٹھ گئی۔ دو پنگتوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا برا تھا۔ یہی تو ہوتا کہ دو کی جگہ چار بجے ختم ہوتی، مگر یہاں تو سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

یکایک شور مچا، ترکاریوں میں نمک نہیں۔ بڑی بہو جلدی جلدی نمک پیسنے لگی، پھول متی غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ مگر اس موقع پر زبان نہ کھول سکتی تھی۔ بارے نمک پسا اور پتیلیوں میں ڈالا گیا۔

گھر میں برف نہ تھی۔ آدمی بازار دوڑایا گیا۔ بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں؟ آدمی ناکام لوٹ آیا۔ مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا۔ پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی، ایسی بد انتظامی اس کے گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے۔ برف جیسی ضروری چیز منگوانے سے فرصت نہ ملی۔ مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہونگے۔ دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برف تک نہیں۔ اچھا پھر کیوں ہلچل مچی۔ ارے غضب، کسی کے شوربے میں ایک مری ہوئی چوہیا نکل آئی۔ یا بھگوان تمھیں آبرو قائم رکھیو۔ چھی، اس پھوہڑ پن کی بھی کوئی حد ہے۔ سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں، نہ اٹھیں تو کیا کریں۔ آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلے گا۔ پھول متی کے دل میں ایسا ابال اٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرائے۔ مجنونانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی۔ ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ سارا کرا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا، بدنامی ہوئی وہ الگ۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ مہمان اٹھ چکے تھے۔ پتلوں پر کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ چاروں لڑکے آنگن میں نادم کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھے۔ بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھی۔ پھول متی شعلے کی طرح ٹوٹ کر آئی اور بولی: "منہ میں کالک لگ گئی کہ نہیں۔ یا ابھی کچھ کسر ہے۔ ڈوب مرو سب کے سب جا کر چلو بھر پانی۔ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہفتوں اس دعوت کا چرچا رہے گا۔ مذاق اڑایا جائے گا۔

تم لوگوں کو کچھ شرم و حیا تو ہے نہیں۔ تمھیں کیا، آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا۔"

کامتاناتھ کچھ دیر تو کھڑا سنتا رہا، آخر جھنجلا کر بولا: اچھا اب رہنے دو، اماں غلطی ہوئی ہم سب مانتے ہیں۔ بہت بڑی غلطی ہوئی، لیکن اب اس کے لئے آدمیوں کو حلال کر ڈالو گی۔ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کر سکتا ہے۔ کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی۔ آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے۔

بڑی بہو نے فرمایا: "ہم کیا جانتے تھے کہ بی بی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہو گا۔ چوہیا ترکاری میں بیٹھی ہو گی، انہوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔"

کامتاناتھ نے بیوی کو ڈانٹا: "اس میں نہ کملا کا قصور ہے نہ تمھارا نہ میرا، اتفاق ہے۔ اتنے بڑے بھوج میں ایک مٹھی ترکاری کڑھاؤ میں نہیں ڈالی جاتی۔ ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دیئے جاتے ہیں۔ اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی نک کٹائی؟ تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔"

پھول متی: "شرماتے تو نہیں، الٹے اور بے حیائی کی باتیں کرنے لگے۔"

کامتاناتھ: "شرماؤں کیوں، کسی کی چوری کی ہے۔ چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن، یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے۔ ہماری نگاہ نہ پڑی۔ بس یہی بات بگڑ گئی۔ ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔"
پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی: "کیا سب کو چوہیا کھلا کر انکا دھرم لے لیتا۔"

کامتاناتھ ماں کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر بولا: "کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو، اماں ان باتوں سے دھرم نہیں جاتا۔ یہ دھرماتما لوگ جو پتل سے اٹھ اٹھ کر گئے ہیں، ان میں ایسا کون ہے جو بھیڑ بکری کا گوشت نہیں کھاتا۔ تالاب کے کچھوے اور گھونگے تک تو کسی سے بچتے نہیں۔ کیا وہ ذرا سی چوہیا ان سب سے ناپاک ہے۔"

پھول متی کے پاس ایسی کٹ حجتوں کا جواب نہ تھا، اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

﴿۲﴾

دو مہینے گزر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتاناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا: "میں تو کملا کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا، آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں۔"

اماناتھ: "تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں، پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصے میں آئے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لئے کم از کم پانچ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

دیاناتھ: "مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچ ہزار اپنے ہونگے تو پانچ ہزار کا کوئی ساجھی اور مل جائے گا۔ میں تو اپنے حصے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔"

کامتا: "دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی آرام سے ہے، بدنصیب ہے تو راجہ کے گھر میں بھی روتی ہے، یہ تو نصیب کا کھیل ہے۔" سیتا نے شرماتے ہوئے کہا: "یہ تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ ان سے کہا جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اسطرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے حصے کے سب روپے دے دوں گا۔"

کامتاناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا: "سنتے ہو اس کی باتیں۔"

اما: "جب ٹھوکر کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔"

کامتا: "اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمھاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"

سیتا: "جی ہاں یاد ہے۔"

اما: "اور جو کہیں تمھیں ولایت جا کر پڑھنے کے لئے وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لئے روپیہ کہاں سے لاؤ گے۔ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟"

کامتا: "اور وظیفہ تمھیں ملے گا، کہو میں آج لکھدوں۔"

اس دلیل نے سیتا ناتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقع اگر اسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لئے درکار ہونگے۔ کملا کے لئے وہ اتنی بڑی مہربانی ہر گز نہیں کر سکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پامال کر دے۔

بولا: "ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی۔"

کامتا: "تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کملا کی شادی کم سے کم خرچ میں کر دی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔ پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم۔ اے بی۔ اے نہ سہی، ججانی سے انکی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سے زیادہ نہ ہو گی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جہیز کے بغیر راضی ہو جائیں گے۔"

اما: "جہیز کا کوئی سوال نہیں، تیسری شادی ہے۔"

کامتا: "یہ نہ کہو، وہ آج چاہیں تو دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے۔ تو یہی صلاح ہے کہ مراری لال کو جواب دیا جائے اور دن دیال کے ساتھ سگائی طے کی جائے۔"

دیا: "اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیئے۔"

کامتا: "اماں سے پوچھنا بیکار ہے، انکی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے۔ وہی پرانے وقتوں کی باتیں۔ مراری لال کے نام پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا۔"

اما: "وہ مانیں گی نہیں، اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی، دیکھ لیجیے گا۔"

کامتا: "ہاں یہ ممکن ہے، زیوروں پر انکا پورا اختیار ہے۔ یہ انکا استری دھن ہے، وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں:"

دیاناتھ: "استری دھن ہے تو کیا اسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے۔"

کامتا: "کسی کی کمائی ہو، استری دھن عورت کی چیز ہے۔"

اما: "یہ سب فانی گورکھ دھندے ہیں۔ استری دھن کوئی چیز نہیں۔ گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں۔ اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لئے تیار نہیں۔ کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہونگے۔ ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو ورنہ تاڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آجائیں تو صاف صاف کہہ دو، تب کیا کر لیں گی۔"

دیا: "ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔"

کامتا: "مجھے تو دھوکہ کی چال اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ جس چیز پر ہمارا حق ہے اس کے لئے ہم لڑ سکتے ہیں۔ جس پر ہمارا حق نہیں اس کے لئے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔"

دیاناتھ: "تو آپ لوگ الگ بیٹھے رہیں، جا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا۔ اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے۔ پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔ آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے گی۔ آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجیے گا۔"

کامتا: "نا بھیا، میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا۔"

سیتا: "میرا بھی استعفٰی ہے۔"

اما: "ان لوگوں کو جانے دو جی، ہم اور تم مل کر رنگ جمالیں گے۔ یہ دھرماتما لوگ ہیں۔ بھیا نوکر ہی ہیں۔ سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے۔ ضرورت تو ہمیں اور تمھیں ہے۔"

بڑی بہو نے فرمایا: "پچاس روپے کے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ۔ اتنے دن مجھے آئے ہو گئے، پیتل کا ایک چھلا بھی نہ بنوایا، توفیق ہی نہ ہوئی، آج دھرماتما بنے ہیں۔"

اما: "اماں کے زیور مل جائیں گے تو انکا ہار تمھیں دے دونگا۔ بھئی خاطر جمع رکھو۔"

بڑی بہو: "مل چکے، وہ گڑ نہیں جو چینٹے کھائیں۔"

دیا: "اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں۔ زیور لیکر نہ آؤں تو منہ نہ دکھاؤں۔"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیا ناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا مامتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہو گئی۔ اس پر اما ناتھ نے اور بھی ردا جمایا: "اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بنک سے روپے ابھی تو نہیں مل سکتے۔ مہینوں خط و کتابت ہو گی، وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا تب کہیں جا کر روپے ملیں گے۔" پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے ہوئے اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ سارے زیور نکال کر دیا ناتھ کو دے دیئے۔ اسطرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

دو تین مہینے اور گزر گئے، زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے۔ اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں۔ اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری سے ہو جاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے اور چاروں کرتے اپنے دل کی، مگر ماں سے صلاح لے لیتے یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ انکی باتوں میں آ جاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا اسے بہت ناگوار گزرا تھا لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اسے بیع کرنے پر راضی ہو گئی۔ ہاں کملا کی شادی کے معاملے میں بیٹوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ شادی مراری کے لڑکے سے ہی ہو گی۔ چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آ گئی۔

پھول متی نے کہا: "ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے۔ تمھیں دس ہزار کا ایک باغ ملا، پچیس ہزار کا مکان۔ بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کملا کا حصہ نہیں ہے؟"

کامتا ناتھ نے نرمی سے کہا: "اماں کملا ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو۔ لیکن حصے کی جو بات کہتی ہو تو کملا کا حصہ کچھ نہیں ہے۔ دادا جب زندہ تھے تب اور بات تھی۔ اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی۔ جو کام ایک ہزار سے ہو جائے اس کے لئے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

اماناتھ نے تصحیح کی: "پانچ ہزار کیوں صاحب دس ہزار کہیئے۔ دعوت ضیافت رسم و رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہونگے؟"

کامتا: "ہاں ٹھیک ہے، دس ہی سمجھو، دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں ہے۔"

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا: "شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہو گی۔ چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں، چاہے دس ہزار، میرے شوہر کی کمائی ہے۔ میں نے مر مر کر جوڑا ہے، اپنی مرضی سے خرچ کرو نگی۔ تم سے مانگنے جاؤں تو مت دینا۔"

کامتا ناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ رہا۔ بولے "اماں تم خواہ مخواہ بات بڑھاتی ہو۔ جس روپے کو تم اپنا سمجھتی ہو وہ تمھارا نہیں ہے، وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔ تم ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے کچھ خرچ نہیں کر سکتیں۔"

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا، بولی: "کیا کہا، پھر تو گویا میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی؟"

کامتا: "وہ روپے تمھارے نہیں، ہمارے ہیں۔"

پھول متی: "تمھارے ہونگے لیکن میرے مرنے کے بعد۔"

کامتا: "نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہو گیا۔"

اما: "اماں قانون تو جانتی نہیں، خواہ مخواہ الجھتی ہیں۔"

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دیک اٹھیں۔ چہرہ لال ہو گیا، بولی: "تمھارا قانون بھاڑ میں جائے۔ ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی، یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا۔ تمھارے دادا ایسے کوئی دھنا سیٹھ نہ تھے۔ میں نے پیٹ اور تن کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں، نہیں تو آج اس گھر میں دھول اڑتی ہوتی، گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے، میں نے تم چاروں بھائیوں کی شادی میں دس دس ہزار روپے خرچ کیے ہیں۔ تمھاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہونگے۔ کملا بھی تو میرے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے، اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کرو نگی، جو کچھ بچے گا، تم لے لینا۔"

اما ناتھ نے جھلا کر کہا: "بھائی صاحب آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں۔ چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے۔ یہ قاعدہ قانون تو جانتی نہیں، بیکار بحث کرتی ہیں۔"

پھول متی نے ضبط کر کے کہا: "اچھا کیا قانون ہے۔ ذرا میں بھی سنوں۔"

اما: "قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے بعد ساری جائیداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے، ماں کا حق صرف گزارہ لینے کا ہے۔"

پھول متی نے پوچھا: "کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟"

اما: "ہمارے رشیوں نے، مہاراج منو نے اور کس نے؟"

پھول متی: "گھر میں نے بنوایا ہے۔ روپے میں نے جوڑے ہیں، باغ میں نے خریدا اور آج اس گھر میں غیر ہوں؟ منو نے یہ قانون بنایا ہے؟ اچھی بات ہے، اپنا گھر بار لو، میری جان چھوڑو۔ اسطرح محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ میں مر جاؤں۔ واہ رے اندھیر، میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتا نہیں توڑ سکتی۔ میں نے گھر بنوایا، میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے۔ اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونیوالی ہے تو ساری جائیداد اپنے نام کرا لیتی۔"

چاروں نوجوانوں پر ماں کی تندہی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی درہ انکی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کچے لوہے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی، دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے پتوں میں بھی حس نہ تھی۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

﴿۴﴾

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہو جائیں گے، اس کا اسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اسنے خونِ جگر پلا پلا کر پالا تھا، جن پر اسے

غرور تھا، وہی آج اسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں، واہ رے زمانے کی خوبی۔ اب اس گھر میں رہنا اسے عذاب معلوم ہوتا تھا، جہاں اس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں، وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے یہ اس کی خوددار طبیعت کے لئے حد درجہ گراں تھا مگر چارہ ہی کیا تھا۔ وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کسکی ناک کٹے گی۔ زمانہ اسے تھوکے تو کیا اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا، بدنامی تو اس کی ہے۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے بڑھیا الگ پڑی ہے۔ مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے۔ جنہیں اس نے ہمیشہ حقارت سے کی نظر سے دیکھا وہی اب اس پر ہنسیں گے۔ نہیں یہ ذلت اس بیکسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی۔ اب اسے اپنے کو ایک نئے طرز کا عادی بنانا پڑے گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب اس نئے ماحول کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اب تک مالکن بنکر رہی اب لونڈی بنکر رہنا پڑے گا۔ ایشور کی یہی مرضی ہے، اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہیں۔ وہ بڑی دیر تک منہ ڈھانپے اپنی اس بیکسی پر روتی رہی۔ ساری رات اس روحانی کوفت میں گزر گئی۔

جاڑوں کی صبح آہستہ آہستہ ڈرتی ڈرتی تاریکی کے پردے سے نکلی جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو۔ پھول متی معمول کے خلاف آج تڑکے ہی اٹھی۔ رات بھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی، رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پنڈت زندہ تھے تب اسے بہت سویرے نہ اٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈ اسے بہت مضر تھی، مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ جھاڑو سے فرصت پا کر اسنے آگ جلائی اور کنکریاں چننے لگی۔ رفتہ رفتہ لڑکے جاگے، بہویں اٹھیں۔ سبھوں نے بڑھیا کو سردی سے سکڑتے ہوئے کام کرتے دیکھا، پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو، شاید وہ بڑھیا کی اس بیکسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔ آج سے پھول متی کا یہی وطیرہ ہو گیا کہ جو کچھ بن پڑے گھر کا کام کرنا، سارے گھر کی خدمت کرنا اور انتظامی امور سے الگ رہنا۔ اس کے چہرے پر جو ایک خود داری کی

جھلک نمایاں تھی اس کی جگہ ایک حسرتناک بے بسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی، جہاں بجلی جلتی تھی وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹمارہا تھا، جسکے بجھانے کے لئے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔

بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو ایک انکاری خط لکھ بھیجا اور دین دیال سے کملا کی شادی ہوگئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں بیٹے تھے لیکن دال روٹی سے خوش تھے۔ بغیر کسی قرارداد کے شادی کرلی۔ تاریخ مقرر ہوئی، بارات آئی، شادی ہوئی، کملا رخصت ہوگئی۔ کملا کے دل پر کیا گزر رہی تھی، اسے بھی کون جان سکتا ہے۔ لیکن چاروں بھائی بیحد خوش تھے، گویا انکے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہوگا، آرام کرے گی۔ تکلیف لکھی ہوگی، تکلیف اٹھائے گی۔ گھر والوں نے جس سے شادی کردی اس میں ہزار عیب بھی ہوں تو یہی اس کا معبود، اس کا مالک، انحراف اس کے وہم وگمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کملا کو کیا دیا گیا، مہمانوں کی خاطر مدارت کی گئی، کس کے ہاں سے نوید میں کیا آیا، اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ "بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اچھا ہی کرتے ہو، مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

جب کملا کے لئے دروازے پر ڈولی آگئی اور کملاماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی تو وہ اسے اپنی کوٹھڑی میں لے گئی اور جو کچھ سو پچاس روپے اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے بیٹی کے آنچل میں ڈالکر بولی: "بیٹی، میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ نہیں تو آج کیا تمھاری شادی اسطرح ہوتی اور تم اسطرح بدا کی جاتیں۔"

کملا نے زیور اور روپے آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں میں رکھ دیئے اور بولی: "اماں، میرے لیے تمھاری آشیر باد لاکھوں روپے کے برابر ہے۔ تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو، نہیں معلوم ابھی تمھیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" پھول

متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اماناتھ نے آکر کہا: "کیا کر رہی ہو۔ کملا چل جلدی کر ساعت ٹلی جاتی ہے۔ وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں، پھر تو دو چار مہینے میں آئے گی ہی، جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا۔" پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا: "میرے پاس اب کیا ہے بیٹا جو میں اسے دونگی۔ جاؤ بیٹی بھگوان سہاگ امر کریں۔"

کملا رخصت ہو گئی، پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

﴿۵﴾

ایک سال گزر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا۔ اسنے اسے بڑی بہو کے لئے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سے کوٹھڑی میں رہنے لگی، جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اب اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اب گھر کی لونڈی تھی۔ گھر کے کسی فرد کے معاملے سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس لیے تھی کہ اسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی یا رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ اماناتھ کا مطب کھلا، احباب کی دعوت ہوئی۔ دیاناتھ نے اخبار جاری کیا پھر جلسہ ہوا۔ سیتاناتھ کو وظیفہ ملا، وہ ولایت پڑھنے گیا پھر جشن ہوا۔ کامتاناتھ کے بڑے لڑکے کا ایگیوپویت ہوا، خوب دھوم دھام ہوا، پھول متی کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ اماناتھ ٹائیفائڈ میں مہینہ بھر بیمار رہے۔ دیاناتھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ ۱۴۴ میں چھ مہینے کے لئے جیل چلے گئے۔ کامتاناتھ نے ایک معاملے میں رشوت لیکر غلط رپورٹ لکھی اور سال بھر کے لئے معطل کر دیئے گئے، پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیں تک نہ پڑیں۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپایوں کی طرح کام کرنا اور کھانا، یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے مگر کھاتا ہے دل سے، وہ بے کہے کام کرتی تھی مگر کھاتی تھی زہر کے نوالوں کی طرح۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا، مہینوں کپڑے نہ دھلتے، کچھ پرواہ نہیں۔ اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ملیریا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل، زمین پر مٹیالا پانی، نم ہوا، سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے تھے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔ پانی میں بھیگ کر سارا کام کیا، آگ جلائی، پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔ کامتاناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے۔ نل کا پانی انہیں موافق نہ تھا۔

کامتاناتھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا: "رہنے دو اماں، میں پانی بھر لاؤں گا۔ کہارن اور مہری آج دونوں غائب ہیں۔"

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: "تم بھیگ جاؤ گے بیٹا، سردی ہو جائے گی۔"

"تم بھی رہنے دو، کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ"

"میں بیمار نہیں پڑوں گی، مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے۔"

اماناتھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مطب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا اس لیے بہت پریشان رہتا تھا۔ "جانے بھی دو بھیا، بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے، اس کا خمیازہ اٹھانے دو۔"

گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سمندر ہے، افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا۔ کنارے کے درختوں کی صرف پھنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں۔ پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری، پاؤں پھسلا، سنبھل نہ سکی۔ پانی میں گر پڑی، پل بھر ہاتھ پاؤں چلائے پھر لہریں اسے نیچے کھینچ لے گئیں۔ کنارے پر دو چار پنڈت چلائے: "ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے۔" دو چار آدمی دوڑے بھی، لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی، ان بل کھاتی لہروں میں جنہیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا ہے۔ ایک نے پوچھا:

"یہ کون بڑھیا تھی؟"

"ارے وہی پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے۔"

"ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا۔"

"اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں۔"

"ہاں سب ہیں بھائی، مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے۔"

﴿منشی پریم چند، واردات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، سن اشاعت ۲۰۱۲ء، ص ۲۵۔۳۵﴾

سعادت حسن منٹو

اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی۔ اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کے ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحبِ روزگار تھا۔ مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی۔ ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔

زبیدہ بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا، بہت شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا۔ کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لئے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری بی کا لٹھا، شنوں اور دو گھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی۔۔۔ ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سنی۔ اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔ اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر میں سوائے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ اسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بلا لے۔

علم الدین نے کہا: "اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہاری ماں میری ماں۔۔۔ جاؤ انہیں لے آؤ۔۔۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔"

زبیدہ بہت خوش ہوئی۔ گھر کافی بڑا تھا۔ دو تین کمرے خالی پڑے تھے۔ وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی۔ علم الدین نے سامان اٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا، چنانچہ وہ بھی پہنچ گیا۔ زبیدہ کی ماں کے لئے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔

وہ بہت ممنون و متشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر۔ اس کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا، اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے۔ مگر وہ طبعاً کنجوس تھی۔

ایک دن اس نے اپنی بیٹی سے کہا، ''مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں۔۔۔ میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔۔۔ حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں۔۔۔ اور زیور الگ۔''

زبیدہ انگیٹھی کے کوئلوں پر پھلکا سینک رہی تھی، "ماں، تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔۔۔"

"کیسی ویسی میں نہیں جانتی۔۔۔ میں نے یہ سب روپے علم الدین کو دے دیے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو۔۔۔ تو یہ سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دوں۔۔۔"

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا۔۔۔ شادی ہوئے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر

نہیں آتے تھے۔ وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں، کئی سفوف، کئی قرص اس کو کھلوائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا۔ ٹونے ٹوٹکے استعمال کیے گئے، تعویذ، دھاگے بھی۔۔۔ مگر مراد بر نہ آئی۔ زبیدہ اس دوران میں تنگ آ گئی۔ ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا: "چھوڑو اس قصّے کو۔۔۔ بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو۔۔۔"

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا: "بیٹا۔۔۔ یہ بہت بڑا قصّہ ہے۔۔۔ تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے۔۔۔ اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا ہے۔"

زبیدہ نے پھلکا چنگیر میں رکھا، "میں کیا کروں۔۔۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

بڑھیا نے کہا، "قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔۔۔ بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیے۔"

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کی گود ہری کرے، مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں، تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بنجر زمین ہے، جس میں کوئی پودا اگ ہی نہیں سکتا۔ راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔ بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحرا میں کھڑی ہے، اس کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہے، جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔۔۔ بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگی، اور وہ اپنی ماں سے کہتی: "یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟" اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا "کوئی بچہ رو نہیں رہا۔۔۔"

"نہیں ماں۔۔۔ رو رہا ہے۔۔۔ بلکہ رو رو کے ہلکان ہوئے جا رہا ہے۔"

اس کی ماں نے کہا: "یا تو میں بہری ہو گئی ہوں، یا تمہارے کان بجنے لگے ہیں۔"

زبیدہ خاموش ہو گئی، لیکن اس کے کانوں میں دیر تک کسی نوزائیدہ بچے کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے نہ کیا۔ لیکن جب وہ اندر اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے گئی تو اس نے قمیص اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر ٹپکتی رہی۔۔۔ لیکن وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب واہمہ ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ پر مسلسل ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے، جو کسی بیاہی عورت کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے۔

وہ اب بہت اداس رہنے لگی۔۔۔ محلے میں بچے شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علم الدین کو اولاد وولاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا۔ کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہوشیار تھا، اس لیے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دوگنا ہو گئی تھی۔

مگر اس آمدن کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جب اس کا شوہر نوٹوں کی گڈی اس کو دیتا، تو اسے اپنی جھولی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی۔۔۔ پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولنے میں بٹھا دیتی۔

ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیے تھے، دودھ کی پتیلی میں پڑے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا: "یہ نوٹ دودھ کی پتیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟"

زبیدہ نے جواب دیا: "بچے بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہو گی۔"

علم الدین بہت متحیر ہوا، "لیکن یہاں بچے کہاں ہیں؟"

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی، "کیا ہمارے ہاں بچے نہیں۔۔۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ ابھی اسکول سے واپس آتے ہوں گے۔۔۔ ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔"

علم الدین سمجھ گیا، اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں۔ لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔ وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ مگر اس کا علاج اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرا دو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا۔ سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہو گئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، غبن تو نہیں کر رہا۔

اس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا: "دکان پر تم کیوں نہیں جاتے؟"

علم الدین نے اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا: "جانم۔۔۔ میں کام کر کے تھک گیا ہوں، اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر دکان کس کے سپرد ہے؟"

"میرا نوکر ہے۔۔۔ وہ سب کام کرتا ہے۔"

"کیا ایمان دار ہے؟"

"ہاں، ہاں۔۔۔ بہت ایمان دار ہے۔۔۔ دمڑی دمڑی کا حساب دیتا ہے۔۔۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا: "مجھے کیوں فکر نہ ہو گی، بال بچے دار ہوں۔ مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں، لیکن ان کا تو ہے۔۔۔ یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھیے کہ بچوں۔۔۔"

علم الدین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، "زبیدہ۔۔۔ ان کا اللہ مالک ہے۔ ویسے میرا نوکر بہت وفادار ہے اور ایمان دار ہے۔ تمہیں کوئی تردّد نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے تو کسی قسم کا تردد نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے۔"

علم الدین بہت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ ان کی جرابیں دھوتی، ان کے لئے اونی سویٹر بنتی۔ کئی بار اس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈلیں منگوائیں، جنہیں وہ ہر صبح پالش کرتی تھی۔

علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے، اس کا علم، علم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا۔ علم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشقہ ہو گیا تھا۔ اب وہ حاملہ ہو گئی۔ اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کیے گئے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا: "دیکھو، اسقاط و سقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو۔"

اس کے دوست نے، جسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کہا: "میں بچے کا کیا کروں گا؟"

"تم مجھے دے دینا۔"

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا۔

زبیدہ بار بار کہتی: "مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیے، پہلے ہی کیا کم ہیں۔"

علم الدین خاموش رہتا۔

اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا، جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس، جو کہ سو رہی تھی، لٹا دیا۔۔۔ اور اسے جگا کر کہا: "زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی۔ یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے؟"

"زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا منا بچہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، علم الدین نے اس سے کہا: "لڑکا ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں۔"

زبیدہ بہت خوش ہوئی، "یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟"

"صبح سات بجے۔"

"اور مجھے اس کا علم ہی نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے، درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔"

علم الدین نے کہا: "ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو گیا۔"

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لہولہان ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے۔ وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔

علم الدین نے اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا، "یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا: "ساری رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا۔۔۔ لعنت ہے ایسی۔۔۔"

اس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی، اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

﴿سعادت حسن منٹو، شکاری عورتیں، سٹار سینٹر، دہلی، سن اشاعت ۱۹۸۰ء، ص۔ ۱۰۰۔ ۱۱۲﴾

سعادت حسن منٹو

موم بتی کے آنسو

غلیظ طاق پر جو شکستہ دیوار میں بنا تھا، موم بتی ساری رات روتی رہی تھی۔ موم پگھل پگھل کر کمرے کے گیلے فرش پر اوس کے ٹھٹھرے ہوئے دھندلے قطروں کے مانند بکھر رہا تھا۔ ننھی لاجو موتیوں کا ہار لینے پر ضد کرنے اور رونے لگی تو اس کی ماں نے موم بتی کے ان جمے ہوئے آنسوؤں کو ایک کچے دھاگے میں پرو کر اس کا ہار بنا دیا۔ ننھی لاجو اس ہار کو پہن کر خوش ہو گئی، اور تالیاں بجاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

رات آئی۔۔۔ میل بھرے طاقچے میں نئی موم بتی روشن ہوئی اور اس کی کانی کانی آنکھ اس کمرے کی تاریکی دیکھ کر ایک لمحے کے لئے حیرت کے باعث چمک اٹھی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی تو اس نے خاموشی سے ٹکٹکی باندھ کر اپنے گردوپیش کو دیکھنا شروع کر دیا۔

ننھی لاجو ایک چھوٹی سی کھٹیا پر پڑی سو رہی تھی، اور خواب میں اپنی سہیلی بندو سے لڑ رہی تھی کہ وہ اپنی گڑیا کا بیاہ اس کے گڈے سے کبھی نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ وہ بدصورت ہے۔

لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی، خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، سامنے بھٹیارے کی بند دکان کے باہر چبوترے پر انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں ضدی بچوں کی طرح مچل مچل کر نیچے گر رہی تھیں۔

گھنٹہ گھر نے غنودگی میں بارہ بجائے، بارہ کی آخری پکار دسمبر کی سرد رات میں تھوڑی دیر تک کانپتی رہی اور پھر خاموشی کا لحاف اوڑھ کر سو گئی۔۔۔ لاجو کی ماں کے

کانوں میں نیند کا بڑا سہانا پیغام گنگنایا مگر اس کی انتڑیاں اس کے دماغ تک کوئی اور بات پہنچا چکی تھیں۔

دفعتاً سرد ہوا کے جھونکے سے گھنگھروؤں کی مدھم جھنجھناہٹ اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے یہ آواز اچھی طرح سننے کے لئے کانوں میں اپنی سماعت کی طاقت بھرنی شروع کر دی۔

گھنگھرو رات کی خاموشی میں مرتے ہوتے آدمی کے حلق میں اٹکے ہوئے سانس کی طرح بجنا شروع ہو گئے، لاجو کی ماں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ گھوڑے کی تھکی ہوئی ہنہناہٹ نے رات کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا اور ایک تانگہ لالٹین کے کھمبے کی بغل میں آ کھڑا ہوا۔ تانگہ والا نیچے اترا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جس کی چق اٹھی ہوئی تھی اور تخت پر ایک دھندلا سایہ بھی پھیلا تھا۔

اپنے کھردرے کمبل کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر تانگے والے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ساڑھے تین روپے کا کریانہ تھا۔ اس میں سے اس نے ایک روپیہ چار آنے اپنے پاس رکھ لیے۔ اور باقی پیسے تانگے کی اگلی نشست کا گدا اٹھا کر اس کے نیچے چھپا دیے۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ کوٹھے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

لاجو کی ماں چندو سنیاری اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ مادھو تانگے والا اندر داخل ہوا اور دروازے کی زنجیر چڑھا کر اس نے چندو سنیاری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا، ''بھگوان جانتا ہے، مجھے تجھ سے کتنا پریم ہے۔۔۔ اگر جوانی میں ملاقات ہوتی تو یاروں کا تانگہ گھوڑا ضرور بکتا!'' یہ کہہ کر اس نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی میں دبا دیا۔

چندو سنیاری نے پوچھا، ''بس؟''

"یہ لے۔۔۔ اور" مادھو نے چاندی کی چونی اس کی دوسری ہتھیلی پر جما دی، "تیری جان کی قسم! بس یہی کچھ تھا میرے پاس!"

رات کی سردی میں گھوڑا بازار میں کھڑا ہنہناتا رہا۔ لالٹین کا کھمبا ویسے ہی اونگھتا رہا۔

سامنے ٹوٹے ہوئے پلنگ پر مادھو بیہوش لیٹا تھا۔ اس کی بغل میں چندو سنیاری آنکھیں کھولے پڑی تھی اور پگھلتے ہوئے موم کے ان قطروں کو دیکھ رہی تھی جو گیلے فرش پر گر کر چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں جم رہے تھے۔ وہ ایکا ایکی دیوانہ وار اٹھی اور لاجو کی کھٹیا کے پاس بیٹھ گئی۔ ننھی لاجو کے سینے پر موم کے دانے دھڑک رہے تھے۔ چندو سنیاری کی دھندلی آنکھوں کو ایسا معلوم ہوا کہ موم بتی کے ان جمے ہوئے قطروں میں اس کی ننھی لاجو کی جوانی کے آنسو چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا اور لاجو کے گلے سے وہ ہار جدا ہو گیا۔

پگھلے ہوئے موم پر سے موم بتی کا جلتا ہوا دھاگا پھسل کر نیچے فرش پر گرا اور اس کی آغوش میں سو گیا۔۔۔ کمرے میں خاموشی کے علاوہ اندھیرا بھی چھا گیا۔

﴿سعادت حسن منٹو، منٹو کے افسانے، لاہور مکتبہ اردو، سن اشاعت ۱۹۴۱ء، ص ۲۱۷۔۲۲۰﴾

سعادت حسن منٹو

ماہی گیر

فرانسیسی شاعر وِکٹر ہیوگو کی ایک نظم کے تاثرات

سمندر رو رہا تھا۔

مقید لہریں پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکڑا ٹکڑا کر آہ وزاری کر رہی تھیں۔

دور پانی کی رقصاں سطح پر چند کشتیاں اپنے دھندلے اور کمزور بادبانوں کے سہارے بے پناہ سردی میں ٹھٹھری ہوئی کانپ رہی تھیں۔

آسمان کی نیلی قبا میں چاند کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

ستاروں کا کھیت اپنے پورے جوبن میں لہلہا رہا تھا۔

فضا سمندر کے نمکین پانی کی تیز بو میں بسی ہوئی تھی۔

ساحل سے کچھ فاصلے پر چند شکستہ جھونپڑیاں خاموش زبان میں ایک دوسرے سے اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کر رہی تھیں۔۔۔

یہ ماہی گیروں کے سر چھپانے کی جگہیں تھیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا جس میں سے چاند کی آوارہ شعاعیں زمین پر رینگ رینگ کر اس کی کاجل ایسی فضا کو نیم روشن کر رہی تھیں۔ اس اندھی روشنی میں دیوار پر ماہی گیر کا جال نظر آرہا تھا اور ایک چوبی تختے پر چند تھالیاں جھلملا رہی تھیں۔

جھونپڑی کے کونے میں ایک ٹوٹی چارپائی، تاریک چادروں میں ملبوس اندھیرے میں سر نکالے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں پھٹے ہوئے ٹاٹ پر پانچ بچے محو

خواب تھے۔۔۔ ننھی روحوں کا ایک گھونسلا جو خوابوں سے تھر تھرا رہا تھا۔ پاس ہی ان کی ماں نہ معلوم کن خیالات میں مستغرق گھٹنوں کے بل بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

یکایک وہ لہروں کا شور سن کر چونکی۔۔۔ بوڑھا سمندر، کسی آنے والے خطرے سے آگاہ، سیاہ چٹانوں، تند ہواؤں اور نصف شب کی تاریکی کو مخاطب کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بچوں کے پاس جا کر ہر ایک کی پیشانی پر اپنے سرد لبوں سے بوسہ دیا۔ اور وہیں ٹاٹ کے ایک کونے پر بیٹھ کر دعا مانگنے میں مصروف ہو گئی۔ لہروں کے شور میں یہ الفاظ بخوبی سنائی دے رہے تھے۔

"اے خدا! اے بے کسوں اور غریبوں کے خدا، ان بچوں کا واحد سہارا، رات کا تاریک کفن اوڑھے سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔۔۔ موت کے عمیق گڑھے میں پاؤں لٹکائے ہے۔ صرف ان کی خاطر وہ ہر روز اس دیو کے ساتھ کشتی لڑتا ہے۔۔۔ اے خدا تو اس کی جان حفاظت میں رکھیو۔۔۔ آہ! اگر یہ صرف نوجوان ہوتے۔۔۔ اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے۔۔۔!"

یہ کہہ کر خدا معلوم اسے کیا خیال آیا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ گئی اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تھر تھراتی ہوئی آواز میں کہنے لگی: "بڑے ہو کر ان کا بھی یہی شغل ہو گا۔ پھر مجھے چھ جانوں کا خدشہ لاحق رہے گا۔"

"آہ۔۔۔! کچھ سمجھ نہیں آتا۔ غربت! غربت!!"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی غربت اور تنگ دامانی کے خیالات میں غرق ہو گئی۔ دفعتاً وہ اس اندھیرے خواب سے بیدار ہوئی۔ اس کے دماغ میں ہوٹلوں کی دیو قامت عمارتیں اور امراء کے راحت کدوں کی تصویریں کھنچ گئیں۔ ان عمارتوں کی دل فریب راحتوں اور امراء کی تعیش پرستیوں کا خیال آتے ہی اس کے دل پر ایک دھند سی چھا گئی۔ کلیجے پر کسی غیر مرئی ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے سے تاریکی میں آوارہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

اس کی یہ حرکت خیالات کی آمد کو نہ روک سکی۔ وہ سخت حیران تھی کہ لوگ امیر اور غریب کیوں ہوتے ہیں جبکہ ہر انسان ایک ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے حل کے لیے اس نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ ایک اور چیز جو اسے پریشان کر رہی تھی، وہ یہ تھی کہ جب اس کا خاوند اپنی جان پر کھیل کر سمندر کی گود سے مچھلیاں چھین کر لاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مارکیٹ کا مالک بغیر محنت کئے ہر روز سیکڑوں روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ محنت تو کریں ماہی گیر اور نفع ہو مارکیٹ کے مالک کو۔ رات بھر اس کا خاوند اپنا خون پسینہ ایک کر دے اور صبح کے وقت آدھی کمائی اس کی بڑی توند میں چلی جائے۔۔۔ ان تمام سوالوں کا جواب نہ پا کر وہ ہنس پڑی اور بلند آواز میں کہنے لگی: "مجھ بے عقل کو بھلا کیا معلوم ہو۔ یہ سب خدا جانتا ہے مگر۔۔۔"

اس کے بعد وہ کچھ کہنے والی تھی کہ کانپ اٹھی، "اے خدا میں گناہگار ہوں۔ تو جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔۔۔ ایسا خیال کرنا کفر ہے۔" یہ کہتی ہوئی وہ خاموشی سے اپنے بچوں کے پاس آکر بیٹھ گئی اور ان کے معصوم چہروں کی طرف دیکھ کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

باہر آسمان پر کالے بادل مہیب ڈائینوں کی صورت میں اپنے سیاہ بال پریشان کیے چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی اگر کوئی بادل کا ٹکڑا چاند کے درخشاں رخسار پر اپنی سیاہی مل دیتا تو فضا پر قبر کی تاریکی چھا جاتی۔ سمندر کی سیمیں لہریں گہرے رنگ کی چادر اوڑھ لیتیں اور کشتیوں کے مستولوں پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اچانک تبدیلی کو دیکھ کر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیتیں۔

ماہی گیر کی بیوی نے اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کئے اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ آیا دن طلوع ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کا خاوند طلوع کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر واپس آجایا کرتا ہے۔ مگر صبح کا ایک سانس بھی بیدار نہ ہوا

تھا۔ سمندر کی تاریک سطح پر روشنی کی ایک دھاری بھی نظر نہ آرہی تھی۔ بارش کا جل کی طرح تمام فضا پر برس رہی تھی۔۔۔ بوڑھا سمندر کھانس رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑی اپنے خاوند کے خیال میں مستغرق رہی۔ جو اس بارش میں اور سمندر کی تند موجوں کے مقابلے میں لکڑی کے ایک معمولی تختے اور کمزور بادبان سے مسلح تھا۔ وہ ابھی اس کی عافیت کے لیے دعا مانگ رہی تھی کہ یکایک اس کی نگاہیں گہرے اندھیرے میں ایک شکستہ جھونپڑی کے سائے کی طرف اٹھیں جو تاروں سے محروم آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے لرز رہا تھا۔

اس جھونپڑی میں روشنی کا نام نہ تھا۔ کمزور دروازہ کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تنکوں کی چھت ہوا کے دباؤ تلے دوہری ہو رہی تھی۔

"آہ! خدا معلوم بیچاری بیوہ کا کیا حال ہے۔۔۔ اسے کئی روز سے بخار آرہا ہے۔" ماہی گیر کی بیوی زیر لب گنگنائی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید کسی روز وہ بھی اپنے خاوند سے محروم ہو جائے۔۔۔ کانپ اٹھی۔ وہ شکستہ جھونپڑی ایک بیوہ کی تھی جو اپنے دو کم سن بچوں سمیت روٹی کے قحط میں اپنی موت کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ مصیبت کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اس پر کوئی سایہ کرنے والا نہ تھا۔ رہا سہا سہارا دو ننھے بچے تھے جو ابھی مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ امڈا۔۔۔ بارش سے بچاؤ کے لئے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا رکھ کر ایک اندھی لالٹین روشن کرنے کے بعد وہ جھونپڑی کے پاس پہنچی اور دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی۔۔۔ لہروں کا شور اور تیز ہواؤں کی چیخ و پکار اس کا جواب تھی۔ وہ کانپی اور خیال کیا کہ شاید اس کی اچھی ہمسایہ گہری نیند سو رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر جواب پھر خاموشی تھا۔۔۔ کوئی صدا، کوئی جواب، اس جھونپڑی کے بوسیدہ لبوں پر نمودار نہ ہوا۔ یکایک دروازہ، جیسے اس بے جان چیز نے رحم کی لہر محسوس کی ہو۔ متحرک ہوا اور کھل گیا۔

ماہی گیر کی بیوی جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی اوراس خاموش قبر کو اندھی لالٹین سے روشن کر دیا۔ جس میں لہروں کے شور کے سوا مکمل سکوت طاری تھا۔ پتلی چھت سے بارش کے قطرے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں سیاہ زمین کو تر کر رہے تھے۔۔۔ فضامیں ایک مہیب خوف سانس لے رہا تھا۔

ماہی گیر کی بیوی اس خوفناک سماں کو دیکھ کر جو جھونپڑی کی چار دیواری میں سمٹا ہوا تھا۔ سر تا پا ارتعاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلکے اور بے اختیار اچھل کر بارش کے ٹپکے ہوئے قطروں کے ساتھ ہم آغوش ہو گئے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور دردناک آواز میں کہنے لگی، "آہ۔۔۔! تو ان بوسوں کا جو جسم کو راحت بخشتے ہیں۔ ماں کی محبت، گیت، تبسم، ہنسی اور ناچ کا ایک ہی انجام ہے۔۔۔ یعنی قبر۔۔۔!! آہ، میرے خدا۔"

اس کے سامنے پھوس کے بستر پر بیوہ کی سرد لاش اکڑی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں دو بچے محو خواب تھے۔ لاش کے سینے میں ایک آہ کچھ کہنے کو رکی ہوئی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھیں جھونپڑی کی خستہ چھت کو چیر کر تاروں سے محروم آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں کچھ پیغام دینا ہو۔ ماہی گیر کی بیوی اس وحشت خیز منظر کو دیکھ کر چلا اٹھی۔ تھوڑی دیر دیوانہ وار ادھر ادھر گھومی۔ یکا یک اس کی نمناک آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اوراس نے لپک کر لاش کے پہلو سے کچھ چیز اٹھا کر اپنی چادر میں لپیٹ لی اور اس دار لخطر سے لڑکھڑاتی ہوئی اپنی جھونپڑی میں چلی آئی۔

چہرے کے بدلے ہوئے رنگ اور لرزاں ہاتھوں سے اس نے اپنی جھولی کو میلے بستر پر خالی کر دیا اور اس پر پھٹی ہوئی چادر ڈال دی۔ تھوڑی دیر بیوہ سے چھینی ہوئی چیز کی طرف دیکھ کر وہ اپنے بچوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ مطلع سمندر کے افق پر سپید ہو رہا تھا۔ سورج کی دھندلی کرنیں تاریکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ماہی گیر کی بیوی بیٹھی

اپنے احساسِ جرم کے شکستہ تار چھیڑ رہی تھی۔ ان غیر مربوط الفاظ کے ساتھ سنہری لہریں اپنی مغموم تانیں چھیڑ تھیں۔

"آہ! میں نے بہت برا کیا ہے! اب اگر وہ مجھے مارے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی۔۔۔ یہ بھی عجیب ہے کہ میں اس سے خائف ہوں جس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ کیا واپس چھوڑ آؤں۔۔۔؟ نہیں۔۔۔ شاید وہ معاف کر دے۔" وہ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی ہوئی تھی کہ ہوا کے زور سے دروازہ ہلا۔ یہ دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اٹھی اور کسی کو نہ پا کر پھر وہیں متفکر بیٹھ گئی۔

"ابھی نہیں۔۔۔ بیچارہ۔۔۔ اسے ان بچوں کیلئے کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔۔۔ اکیلے آدمی کو سات پیٹ پالنے پڑتے ہیں اور۔۔۔ مگر یہ شور کیا ہے؟"

یہ آواز چیختی ہوئی ہوا کی تھی۔ جو جھونپڑی کے ساتھ رگڑ کر گزر رہی تھی۔

"اس کے قدموں کی چاپ۔۔۔! آہ! نہیں، ہوا ہے۔" یہ کہ کر وہ پھر اپنے اندرونی غم میں ڈوب گئی۔ اب اس کے کانوں میں ہواؤں اور لہروں کا شور مفقود ہو گیا۔۔۔ سینے میں مختلف خیالات کا تصادم کیا کم شور تھا۔

آبی جانور ساحل کے آس پاس چلا رہے تھے۔ پانی میں گھسے ہوئے سنگ ریزے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کھنکھنا رہے تھے۔ کشتی کے چپوؤں کی آواز صبح کی خاموش فضا کو مرتعش کر رہی تھی۔۔۔ ماہی گیر کی بیوی کشتی کی آمد سے بے خبر اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتاً دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا۔۔۔ صبح کی دھندلی شعاعیں جھونپڑی میں تیرتی ہوئی داخل ہو گئیں۔ ساتھ ہی ماہی گیر کاندھوں پر ایک بڑا جال ڈالے دہلیز پر نمودار ہوا۔ اس کے کپڑے رات کی بارش اور سمندر کے نمکین پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ آنکھیں کم خوابی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ جسم سردی اور غیر معمولی مشقت سے اکڑا ہوا تھا۔

"نسیم کے ابا، تم ہو!" ماہی گیر کی بیوی چونک اٹھی۔ اور عاشقانہ بیتابی سے اپنے خاوند کو چھاتی سے لگالیا۔

"ہاں میں ہوں پیاری۔"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر کے کشادہ مگر مغموم چہرے پر مسرت کی ایک دھندلی سی روشنی چھاگئی۔ وہ مسکرایا۔۔۔ بیوی کی محبت نے اس کے دل سے رات کی کلفت کا خیال محو کر دیا تھا۔

"موسم کیسا تھا؟" بیوی نے محبت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"تند!"

"مچھلیاں ہاتھ آئیں؟"

"بہت کم۔۔۔! آج رات تو سمندر قزاقوں کے گروہ کے مانند تھا۔"

یہ سن کر اس کی بیوی کے چہرے پر مردنی چھاگئی۔ ماہی گیر نے اسے مغموم دیکھا اور مسکرکر بولا: "تو میرے پہلو میں ہے۔۔۔ میرا دل خوش ہے۔"

"ہوا تو بہت تیز ہوگی؟"

"بہت تیز، معلوم ہورہا تھا کہ دنیا کے تمام شیطان مل کر اپنے منحوس پر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔۔۔ جال ٹوٹ گیا۔ رسیاں کٹ گئیں اور کشتی کا منہ بھی ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔" پھر اس گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا: "مگر تم شب بھر کیا کرتی رہی ہو پیاری؟"

بیوی کسی چیز کا خیال کر کے کانپی اور لرزاں آواز میں جواب دیا: "میں۔۔۔! آہ ،کچھ بھی نہیں۔۔۔ سیتی پروتی رہی، تمہاری راہ تکتی رہی۔۔۔ لہریں بجلی کی طرح کڑک رہی تھیں۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔"

"ڈر۔۔۔! ہم لوگوں کو ڈر کس بات کا۔۔۔"

"اور ہاں، ہماری ہمسایہ بیوہ مر گئی ہے۔" بیوی نے اپنے خاوند کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ماہی گیر نے یہ دردناک خبر سنی۔ مگر اسے کچھ تعجب نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر گھڑی اس عورت کی موت کی خبر سننے کا متوقع تھا۔ اس نے آہ بھری اور صرف اتنا کہا، "بیچاری سدھار گئی!"

"ہاں دو بچے چھوڑ گئی ہے۔ جو لاش کے پاس لیٹے ہوئے ہیں۔"

یہ سن کر ماہی گیر کا جسم زور سے کانپا اور اس کی صورت سنجیدہ و متفکر ہو گئی۔ ایک کونے میں اپنی اونی ٹوپی، جو پانی سے بھیگ رہی تھی پھینک کر سر کھجلانا شروع کر دیا۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے آپ سے بولا: "پانچ بچے تھے۔ اب سات ہو گئے۔۔۔ اس سے پیشتر ہی اس تند موسم میں ہمیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔۔۔ اب، مگر خیر۔۔۔ یہ میرا قصور نہیں، اس قسم کے حوادث بہت گہرے معانی رکھتے ہیں۔"

وہ کچھ عرصے تک اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دبائے سوچتا رہا۔ اسے یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ خدا نے ان بچوں سے جو اس کی مٹھی کے برابر بھی نہیں، ماں کیوں چھین لی ہے۔۔۔؟ ان بچوں سے جو نہ کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی چیز کی خواہش کر سکتے ہیں۔ اس کا دماغ ان سوالوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔

"شاید ایسی چیزوں کو ایک پڑھا لکھا ہی سمجھ سکتا ہے۔" اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا: "پیاری جاؤ انہیں یہاں لے آؤ۔ وہ کس قدر وحشت زدہ ہوں گے اگر صبح اپنی ماں کی لاش کے پاس بیدار ہوئے۔ ان کی ماں کی روح سخت بے قرار ہو گی۔۔۔ جاؤ انھیں ابھی لے کر آؤ۔"

یہ کہہ کر وہ دل میں سوچنے لگا کہ وہ ان بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے گا۔ وہ بڑے ہو کر اس کے گھٹنوں پر چڑھنا سیکھ جائیں گے۔ خدا ان اجنبیوں کو جھونپڑی میں دیکھ کر بہت خوش ہو گا اور انہیں زیادہ کھانے کو عطا کرے گا۔

"تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے پیاری۔۔۔! میں زیادہ محنت سے کام کروں گا۔"
اور پھر اپنی بیوی کو چارپائی کی طرف روانہ ہوتے ہوئے دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا:
"مگر تم سوچ کیا رہی ہو۔۔۔ اس دھیمی چال سے نہیں چلنا چاہیے تمھیں۔"

ماہی گیر کی بیوی نے چارپائی کے پاس پہنچ کر چادر کو الٹ دیا۔

"وہ تو یہ ہیں۔"

دو بچے صبح کی طرح مسکرا رہے تھے۔

﴿سعادت حسن منٹو، آتش پارے اور سیاہ حاشیے، ساقی بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، سن اشاعت ۱۹۸۴ء، ص ۵۹۔ ۷۰﴾

افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف

احمد ندیم قاسمی

پاکستان کے معروف شاعر، ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو موضع انگہ، ضلع خوشاب میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندانی نام احمد شاہ تھا۔ انھوں نے قرآن مجید کی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں شیخوپورہ سے میٹرک اور ۱۹۳۵ء میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے بی اے کیا۔ ان کی ملازمت کا آغاز ریفارز کمشنر لاہور کے دفتر میں محرری سے ہوا، ۱۹۳۹ء میں ملتان کے ایکسائز آفس میں سب انسپکٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ۱۹۴۲ء میں اس عہدے سے دستبردار ہو کر دارالاشاعت پنجاب لاہور سے منسلک ہوئے اور "پھول" اور تہذیب نسواں" اور ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۶۳ء میں اپنا ادبی جریدہ "فنون" جاری کیا۔

اُن کی شاعری کے "دھڑکنیں"، "جلال و جمال"، "شعلہ گل"، "دشت وفا"، "محیط" وغیرہ جیسے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے اور "چوپال"، "بگولے"، "طلوع و غروب"، "گرداب"، "سیلاب"، "آنچل"، "آبلے"، "آس پاس"، "درودیوار"، "سناٹا"، "بازار حیات" جیسے سولہ افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ اُن کا انتقال ۱۰/ جولائی ۲۰۰۶ء کو ہوا۔

﴿سید قاسم محمود، انسائیلوپیڈیا پاکستانیکا، الفصل لاہور، سن اشاعت نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۶﴾

اشفاق احمد

اردو ادب کے معروف ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو مکتسر، ضلع فروزپور میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا اور دیال سنگھ کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ پھر اٹلی کے دارالحکومت روم میں روم یونیورسٹی میں دو سال تک اردو کے لیکچرر رہے اور وہیں اطالوی زبان کا ڈپلوما کیا۔ گرینوبل یونیورسٹی فرانس سے فرانسیسی زبان کا ڈپلوما کورس مکمل کیا۔ پاکستان واپسی پر اپنا اشاعت گھر "داستان سرائے" قیام کیا اور رسالہ "داستان گو" جاری کیا۔ آر سی ڈی کے علاقائی ثقافتی انسٹی ٹیوٹ میں چار سال تک ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیے۔ تیس سال تک اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے متعدد ڈرامے لکھے۔ "ایک محبت سو افسانے" اور "اُجلے پھول" اُن کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ہیں۔ اُن کا افسانہ "گڈریا" بہت مشہور ہے۔ ۷ ستمبر ۲۰۰۴ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

﴿سید قاسم محمود، انسائیلوپیڈیا پاکستانیکا، الفصل لاہور، سن اشاعت نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۲﴾

پریم چند

پریم چند کا اردو افسانہ نگاری کا ایک بڑا مقام ہے۔ پریم چند کی پیدائش بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی میں ۳۱جولائی ۱۸۸۰ء کو ہوئی۔ اُن کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور اُن کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق اُنھوں نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اُن کا ادبی سفر ۱۹۰۰ء میں شروع ہوا اور انھوں نے اردو افسانوی ادب کو بیش بہا ادبی سرمایہ عطا کیا۔ انھوں نے بنارس کے ایک ہفتہ وار "خلق" میں "اسرار معابد" کے نام سے قسط وار ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ پھر اُنھوں "ہم خرما و ہم ثواب" اور "کشن" دو ناول لکھے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اُن کے ناولوں میں "گئودان"، "میدان عمل"، "چوگان ہستی"، "گوشہء عافیت"، "بازار حسن" وغیرہ اور افسانوی مجموعوں میں "پریم پچیسی"، "پریم بتیسی"، "واردات"، "خواب و خیال"، "زادراہ"، "پریم چالیسی"، "آخری تحفہ" وغیرہ شامل ہیں۔ پریم چند ۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو انتقال کر گئے۔

﴿ابن کنوال، اردو افسانہ، کتابی دنیا، دہلی، سن اشاعت ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۔۱۷﴾

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس کا شمار اردو کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر ہندوستانی سماج کی اصلاح اور کمزوروں اور مزدوروں کے حقوق کے لیے جدوجہد کی۔

وہ ۷ جون ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کے تاریخی شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ وہ مولانا الطاف حسین حالی کے نواسے خواجہ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین کے چچازاد بھائی تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم پانی پت کے "حالی مسلم اسکول" میں حاصل کی اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

۱۹۳۶ء میں اپنا پہلا افسانہ "ابابیل" لکھا اور یوں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ان کے اس افسانہ کی شہرت یورپ تک پہنچی اور "ابابیل" کا ترجمہ مختلف یورپین زبانوں میں ہو گیا۔ اُنھوں نے ادب، صحافت اور فلم کی دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔ اُن کے متعدد افسانوی مجموعے: "زعفران کے پھول"، "پاؤں میں پھول"، "اندھیرا اجالا"، "کہتے ہیں جس کو عشق" اور ڈرامے:

"زبیدہ"، "یہ امرت ہے"، "چودہ گولیاں"، "انقلاب" اور سفر نامہ "مسافر کی ڈائری" شائع ہو چکے ہیں۔ متعدد فلموں کے مصنف اور ڈائریکٹر بھی رہے اور اُن کی بنائی ہوئی فلموں میں "آوارہ"، "پردیسی"، "دھرتی کا لال"، نیا سنسار" وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا انتقال یکم جون ۱۹۸۷ء کو ہوا۔

﴿ابن کنوال، اردو افسانہ، کتابی دنیا، دہلی، سن اشاعت ۲۰۱۱ء، ص ۴۴۔۴۶﴾

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو کا نام اردو افسانوی ادب میں سر فہرست ہے اور اُن کا ذکر ہوئے بغیر کسی بھی اردو افسانوی ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالہ ضلع لدھیانہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ وہ میٹرک تک امر تسر کے مسلم ہائی اسکول میں اور پھر کچھ عرصے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی زیر تعلیم رہے۔ مگر پھر تعلیم چھوڑ کر بمبئی گئے اور ہفت روزہ فلمی رسالے "مصور" میں ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے کام کیا۔ منٹو جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کر کے گئے۔

منٹو ایک بے باک قلمکار تھے اور جو سچ سمجھتے تھے بلا خوف و تردید اس کی حمایت کرتے تھے اور اِنہیں اپنے افسانوں میں بلا جھجک بیان کرتے تھے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آتش پارے" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ پھر "منٹو کے افسانے"، "دھواں"، "جنازے"، "لذّتِ سنگ"، "سیاہ حاشیے"، "خالی بوتلیں خالی ڈبے"، "برقعے"، "رتی ماشہ تولہ"، "شکاری عورتیں"، "نمرود کی خدائی"، "سڑک کے کنارے"، "سرکنڈوں کے پیچھے" وغیرہ منظر عام پر آئے۔

سعادت حسن منٹو ۱۸/ جنوری ۱۹۵۵ء کو لاہور میں اس عالم فنا سے رحلت فرمائے۔

﴿ابن کنوال، اردو افسانہ، کتابی دنیا، دہلی، سن اشاعت ۲۰۱۱ء، ص ۲۸۔۳۰﴾

قدرت اللہ شہاب

اردو ادب کی تاریخ میں قدرت اللہ شہاب کا اہم نام ہے۔ قدرت اللہ شہاب یکم جنوری ۱۹۲۰ میں گلگت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پرنس آف ویلیز کالج جموں سے ۱۹۳۷ میں بی۔ ایس۔ سی کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج، لاہور سے انگلش میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۴۰ میں آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ ان کو ریاست جموں و کشمیر کا پہلا مسلم آئی۔ سی۔ ایس افسر ہونے کا

اعزاز بھی حاصل ہے۔ انھوں نے تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے مختلف اضلاع میں آئی۔ سی۔ ایس افسر کے طور پر اپنے سرکاری فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۷ کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں وہ سکریٹری جنرل آزاد کشمیر، ڈپٹی سکریٹری وزارت آزاد کشمیر، ڈپٹی کمشنر ضلع جھنگ، ڈائریکٹر انڈسٹریز حکومت پنجاب، سکریٹری گورنر جنرل آف پاکستان ملک غلام محمد، سکریٹری گورنر جنرل آف پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا، سکریٹری صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان، سکریٹری اطلاعات حکومت پاکستان، سکریٹری وزارت تعلیم حکومت پاکستان، سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ (دو بار)۔۔۔ جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر اور یونیسکو ایگزیکٹو بورڈ کے رکن کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۳۸ میں "چندراوتی" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کا فسادات کے موضوع پر مبنی ایک طویل اور شاہ کار ناولٹ "یاخدا" ۱۹۴۸ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے تین افسانوی مجموعے "نفسانے"، "ماں جی" اور "سرخ فیتہ" شائع ہوئے۔ یہ تینوں افسانوی مجموعے ان کی زندگی میں کئی بار شائع ہوئے۔ لیکن اُن کی شہرت کی اصل بنیاد اُن کی خودنوشت کوائف زندگی "شہاب نامہ" ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء کو اس عالم فنا سے دار بقا کو رحلت فرمائی۔

﴿بلال احمد تانتری، قدرت اللہ شہاب اور اُن کی کتاب "شہاب نامہ"، اردو ریسرچ جرنل، ایڈیٹر ڈاکٹر عزیز اسرائیل، شمارہ ۱۲، اکتوبر تا ستمبر ۲۰۱۷ء، http://www.urdulinks.com/urj/?p=1766﴾

کرشن چندر

کرشن چندر اردو ادب کا، بالخصوص افسانوی اردو ادب کا عظیم نام ہیں جنھیں ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار بھی کہا گیا۔ وہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم کشمیر میں مکمل ہوئی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گئے۔ انھوں نے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور سے دہلی آکر ریڈیو سے منسلک ہوئے اور پھر بمبئی جاکر فلموں کے لئے کہانیاں اور مکالمے لکھنے لگے۔

اُنھوں نے طالبعلمی کے زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا اور اُن کا پہلا افسانہ "یرقان" ۱۹۳۶ء میں "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ "طلسم خیال" ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آیا۔ پھر "نظارے"، "زندگی کے موڑ پر"، "نغمے کی موت"، "پرانے خدا"، "ہم وحشی ہیں"، "کرن داتا"،

"تین غنڈے"، "شکست"، طوفان کی کلیاں"، "ایک گدھے کی سرگزشت"، "آسمان روشن ہے" جیسے بہت سے مجموعے اور ناول شائع ہوئے۔

۱۹۵۶ء میں انھیں سویت نہرو ایوارڈ ملا۔ کرشن چندر کا انتقال ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہوا۔

﴿ابن کنوال، اردو افسانہ، کتابی دنیا، دہلی، سن اشاعت ۲۰۱۱ء، ص ۲۲۔۲۷﴾